اُس پار
امجد اسلام امجد

حمیدی

اُس پار

امجد اسلام امجد

جہانگیر بک ڈپو اُردو بازار ○ لاہور

75th Year Of Publishing

جہانگیر بک ڈپو۔ اُردو بازار لاہور

سال اشاعت	......	1998ء
ناشر	......	فواز نیاز
مطبع	......	نیاز جہانگیر پرنٹرز' لاہور
قیمت		165 روپے
[illegible]	......	جہانگیر بکس کمیٹی چوک راولپنڈی 'فون 539609

اِنتساب
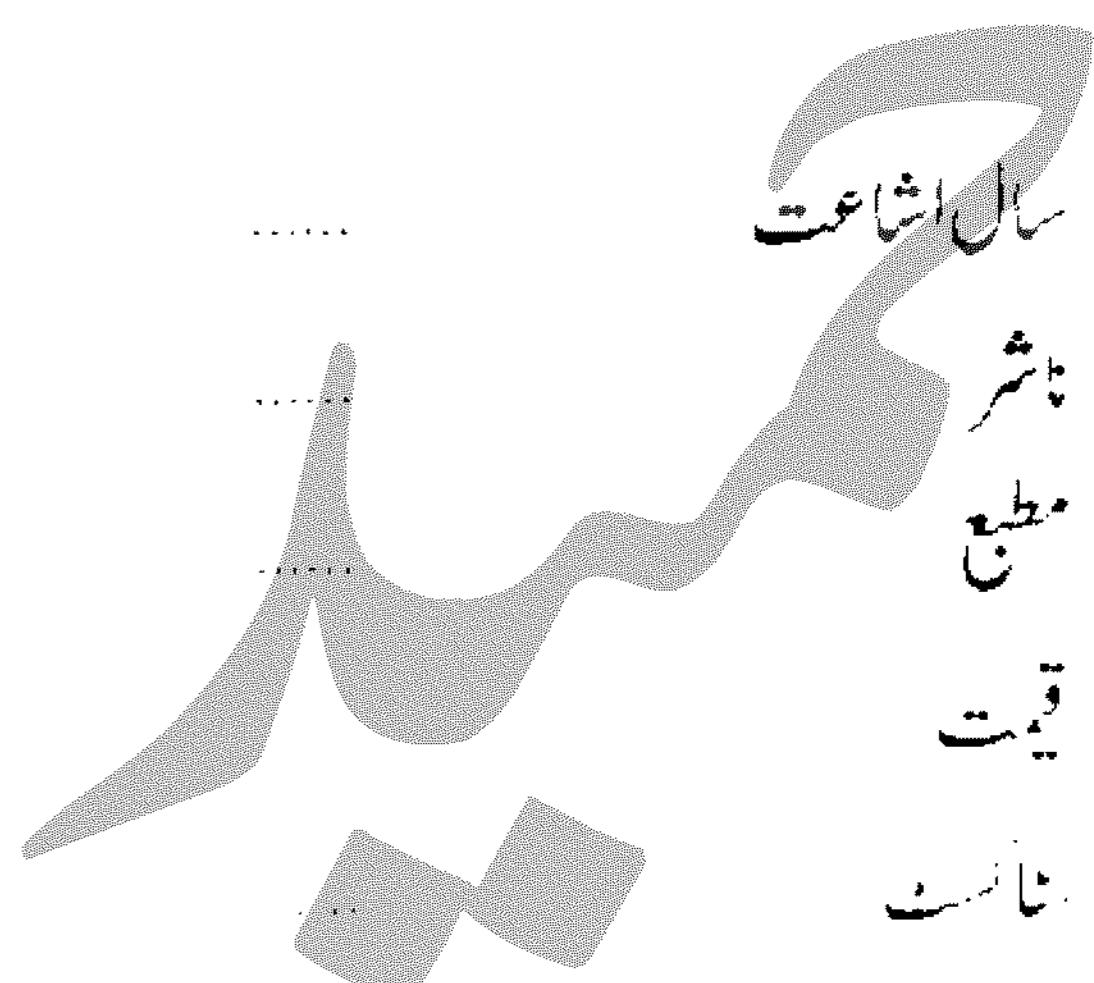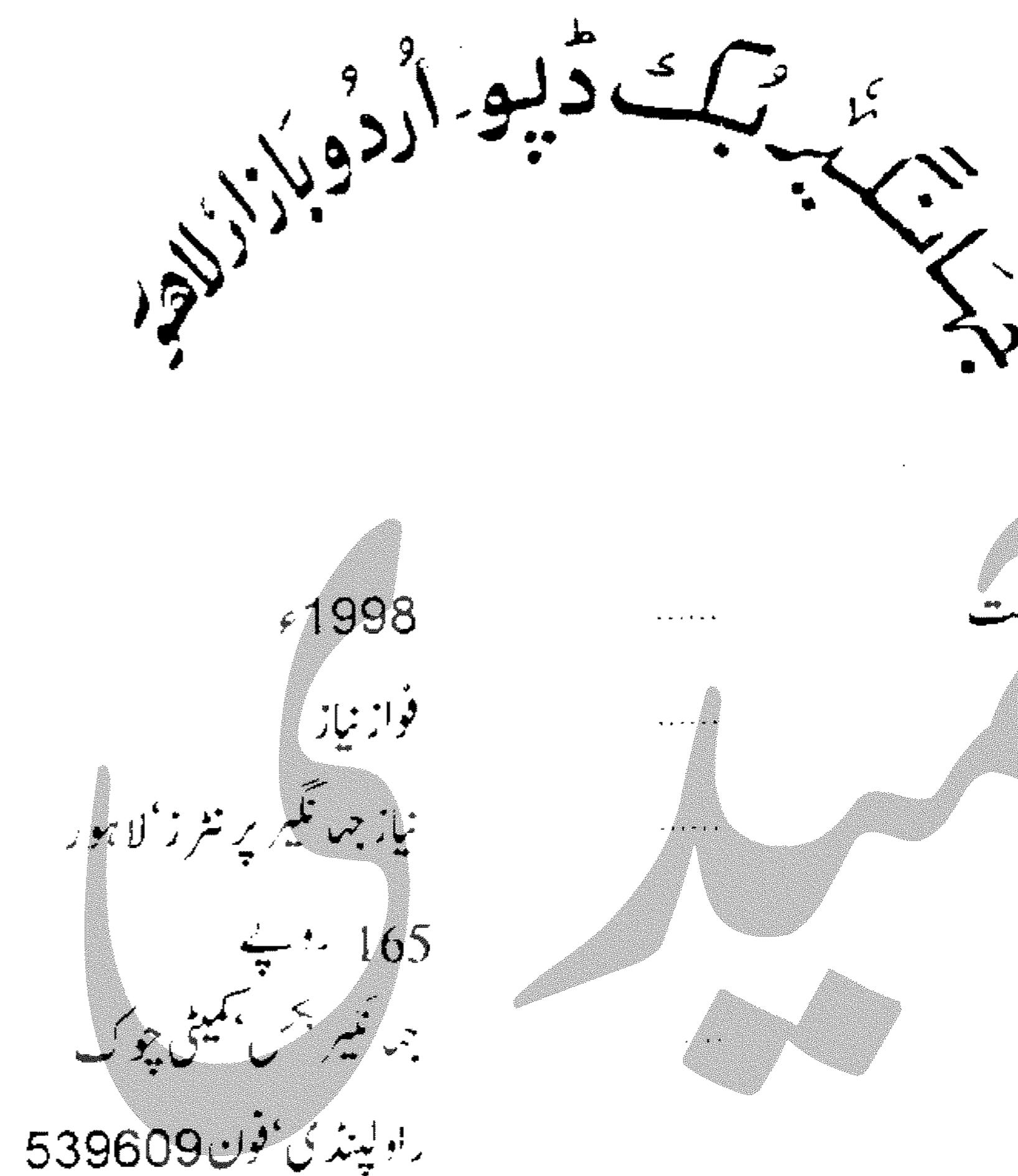
برادرانِ عزیز

محسن اسلام
اور

احسن اسلام

کے نام

اُس پار

گزشتہ دنوں کاغذات کو ترتیب دیتے ہوئے مجھے اپنی ایک پرانی بیاض مل گئی جس میں
میرا ۱۹۶۲ء سے ۱۹۶۷ء تک کا کلام جمع ہے۔ اس سارے کلام میں سے میں نے چند نظمیں
"برزخ" میں اور کچھ "ساتواں در" میں شامل کی تھیں۔ اب جو غور کیا تو معلوم ہوا کہ کچھ اور چیزیں
بھی قابلِ اشاعت تھیں اور بہت غور کرنے پر بھی یاد نہ آیا کہ انھیں انتخاب نہ کرنے کی وجہ یا
وجوہات کیا تھیں! اس سے میرا ذہن اس مسئلے کی طرف مُڑ گیا کہ شاعری کا انتخاب اور پسندیدگی
کیا واقعی "اضافی" بات ہے اور ایک خاص عمر، وقت، ماحول اور فضا میں جو چیز جس طرح
لگتی ہے کسی اور وقت میں مختلف کیوں ہو جاتی ہے! کیا ذوقِ سلیم کا سفر خطِ مستقیم میں آگے
کی طرف بڑھتا رہتا ہے یا اس میں کچھ راؤنڈ اباؤٹ بھی آتے ہیں۔

کبھی چھوڑی ہُوئی منزل بھی یاد آتی ہے راہی کو

تو کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ آدمی اپنے ہی بنائے ہُوئے امیجز کے بتوں کو سجدے کرتے کرتے
نمائش گاہِ جہاں سے رُخصت ہو جاتا ہے اور ہر دم یہی سمجھتا رہتا ہے کہ وہ ایک مسلسل
ارتقا کے عمل میں ہے!

اُس بیاض کی شاعری میں نے اٹھارہ سے تیئس سال کی عُمر کے دوران کی تھی۔ آج
کے مقابلے میں شاید اُس وقت مجھے بہت سی باتوں کا پتہ نہیں تھا۔ فنّی اور فکری ہر دو اعتبار
سے بھی بہت سے مرحلوں سے میری آشنائی خاصی محدود تھی اور منفرد "آواز" اور لہجے
کا تو شاید ابھی تصور بھی پیدا نہیں ہوا تھا مگر اُس شاعری میں جو جدّت، شدّت اور اظہار کی
ت ہے اُس کو اب میں بہت مِس (MISS) کرتا ہوں۔ وقت کے ساتھ ساتھ بہت سی

چیزوں کو بدلنا تھا سو وہ بدل گئیں لیکن پریشانی کی بات یہ ہے کہ اس عمل میں کچھ ایسی چیزیں بھی چھوٹ گئیں جو رکھنے، برتنے اور بڑھانے کے قابل تھیں۔ ہو سکتا ہے یہ محض میرا نوسٹیلجیا (NOSTALGIA) ہو یا میرے تحت الشعور میں چھپے اور دبے ہوئے کچھ لمحوں کا عکس گریزاں ہو جو دھیان کے منظر نامے پر ایک کوندے کی طرح لپکا ہو اور بس ...... یا شاید کچھ اور بات ہو !!

گزشتہ دنوں میرے چاروں شعری مجموعے "خزاں کے آخری دن" کے نام سے ایک جلد میں شائع ہونے لگے تو میں نے اپنا سارا کلام ایک ساتھ پڑھا اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ ان بیس برسوں میں مختلف چیزوں کے بارے میں میرے رجحان، رویّے، اپروچ اور پسندیدگی میں کس قدر تبدیلی واقع ہوئی ہے اور مختلف اوقات میں کس طرح میں کچھ مخصوص موضوعات اور HANG UPS کا اسیر رہا ہوں لیکن اس کے ساتھ ہی میں اس بات پر خدا کا شکر بھی ادا کیا کہ اس نے اس سفر کے دوران مجھے فکری منافقت سے بچائے رکھا اور ہر "تبدیلی" کو اپنی بساط بھر سمجھنے اور کہنے شعور عطا کیا۔

اور آخر میں ایک شعر جو گزشتہ کئی مہینوں سے میرے ذہن پر سوار ہے اس کی زبان فارسی ہے لیکن ایسی کہ میرے جیسے کم فہم کی سمجھ میں بھی آ گئی ہے، آپ تو سخن فہم لوگ ہیں۔

ملالِ آدمیاں دمبدم دِگر گوں است
منم کہ مدتِ عُمرے بیک ملال گذشت

امجد اسلام امجد

۲۴ - ۵ - ۹۲

ایک ضروری وضاحت

"اُس پار" کے پہلے ایڈیشن کے دیباچے میں (جو آپ ابھی ابھی پڑھ چکے ہیں) میں نے اپنی اُس شاعری کے حوالے سے جو میرے پہلے شعری مجموعے "برزخ" کی اشاعت کے وقت لکھی جا چکی تھی لیکن جسے میں نے کسی نہ کسی وجہ سے کتاب میں شامل نہیں کیا تھا، کچھ باتیں کی تھیں اس گفتگو سے میرا مقصد محض اپنے قارئین کو اُس ذاتی احساس اور معیارِ تنقید و انتخاب کی تبدیلی سے آگاہ کرنا تھا۔ جو وقت کے ساتھ ساتھ خود لکھنے والے میں اپنی تحریروں کے بارے میں مرتب ہوتا رہتا ہے۔

کچھ پیسٹنگ کی گڑبڑ اور کچھ میری بے احتیاطی کے باعث کچھ باتیں آپس میں اس طرح گڈمڈ ہو گئیں کہ بادی النظر میں بہت سے قارئین نے "اُس پار" کو میری اُسی چھوڑی ہوئی پرانی شاعری کا مجموعہ سمجھا اور کئی تنقیدی تبصروں میں بھی نقّاد اسی غلط فہمی کا شکار نظر آئے۔

اب "اُس پار" کے نئے ایڈیشن کی اشاعت پر میں مناسب سمجھتا ہوں کہ اس خود رو اُلجھن کو صاف کر دیا جائے اور اس بات کی وضاحت کر دی جائے کہ "اُس پار" کا سارا کلام "ذرا پھر سے کہنا" کے بعد کا لکھا ہوا ہے اور اس میں ایک بھی پرانی چیز شامل نہیں ہے۔

امجد اسلام امجد

ترتیب

حمد

اے ربِّ ملائک وجن وبشر میں حاضر ہوں، میں حاضر ہوں
خدمت میں تری شرمندہ نظر، میں حاضر ہوں، میں حاضر ہوں

جو تیری ثنا کے لائق ہو اِک لفظ بھی ایسا پاس نہیں
کیا تابِ سخن، کیا عرضِ ہُنر، میں حاضر ہوں، میں حاضر ہوں

قطرے کی نگاہِ حیراں پر دریا کی حقیقت کیسے کھُلے
میں جانتا ہوں یہ بات، مگر، میں حاضر ہوں، میں حاضر ہوں

مرے چار طرف ہیں دروازے، مِرا سرمایہ کچھ اندازے
مُجھ بے خبرے کو بخشش خبر، میں حاضر ہوں، میں حاضر ہوں

یہ ارض و سما کی پہنائی، یہ میری اُدھوری بینائی
ہے شوقِ سفر ہی زادِ سفر، میں حاضر ہوں، میں حاضر ہوں

مرے کان تری آہٹ سے سجیں، مرے سانس تری خوشبو میں پلیں
مری آنکھیں اپنے خواب سے بھر، میں حاضر ہوں، میں حاضر ہوں

اے نورِ ازل، اے حسنِ ابد، سبحان اللہ، سبحان اللہ
رہیں روشن تیرے شمس و قمر، میں حاضر ہوں، میں حاضر ہوں

حمد

اے ربِّ ملائک و جن و بشر میں حاضر ہوں، میں حاضر ہوں
خدمت میں تری شرمندہ نظر، میں حاضر ہوں، میں حاضر ہوں

جو تیری ثنا کے لائق ہو اک لفظ بھی ایسا پاس نہیں
کیا تابِ سخن، کیا عرضِ ہنر، میں حاضر ہوں، میں حاضر ہوں

قطرے کی نگاہِ حیراں پر دریا کی حقیقت کیسے کھلے!
میں جانتا ہوں یہ بات، مگر، میں حاضر ہوں، میں حاضر ہوں

مرے چار طرف ہیں دروازے، مرا سرمایہ کچھ اندازے
مجھ بے خبرے کو بخشش خبر، میں حاضر ہوں، میں حاضر ہوں

یہ ارض و سما کی پہنائی ، یہ میری اُدھوری بینائی
ہے شوقِ سفر ہی زادِ سفر، میں حاضر ہوں، میں حاضر ہوں

مرے کان تری آہٹ سے سجیں، مرے سانس تری خوشبو میں پلیں
مری آنکھیں اپنے خواب سے بھر، میں حاضر ہوں، میں حاضر ہوں

اے نورِ ازل، اے حسنِ ابد، سبحان اللہ، سبحان اللہ
رہیں روشن تیرے شمس و قمر، میں حاضر ہوں، میں حاضر ہوں

حمد

وہ جو معبود ہے
ہر جگہ جلوہ گر اور موجود ہے
سجدہ گہ ہے جہاں، وہ ہی مسجود ہے
سب کا مقصود ہے

اُس کی حیرت کے ہیں آئینے، شش جہت
سب زمانے اُسی کے یقیں کا گماں
سارے رستوں کا رُخ اُس کے گھر کی طرف
ساری آنکھیں اُسی خواب کی باندیاں

اُس کا خوابِ حسیں
سجدہ گاہِ جہاں میں جبیں در جبیں

سانس لیتا ہُوا، جگمگاتا ہُوا
روشنی کے خزانے لُٹاتا ہُوا
اُس کی باتوں کی خُوشبو سے مہکے ہُوئے
آسماں اور زمیں

حُسن ہے بے کراں، آنکھ محدود ہے
وہ ہے سب کی طلب، سب کا مقصود ہے
ہر جگہ جلوہ گر اور موجود ہے
وہ جو معبود ہے،
وہ جو مسجود ہے۔

حمد

میں اُس کا نام لیتا ہوں
تو ہونٹوں پر تبسم کی
دھنک لہرانے لگتی ہے
میں اُس کو یاد کرتا ہوں
تو اِک مانوس سی خوشبو
مجھے مہکانے لگتی ہے

وہ میرے دل میں رہتا ہے گُلِ اُمید کی صُورت،
زمانے کی شبِ تاریک میں خورشید کی صُورت!

نعت

حرا کی خلوتوں میں جو شۂ لولاک پر اُترا
رہے گا حشر تک امجدؔ اُسی پیغام کا چرچا

نہ رستہ ہے، نہ منزل ہے عجب آشوب میں دل ہے
مرے ہادی! مرے رہبر! مرے مولا! مرے آقا!

خوشا راہیں کہ جن پر آپؐ نے اپنے قدم رکھے
خوشا آنکھیں کہ جن کے بخت میں تھا آپؐ کا چہرا
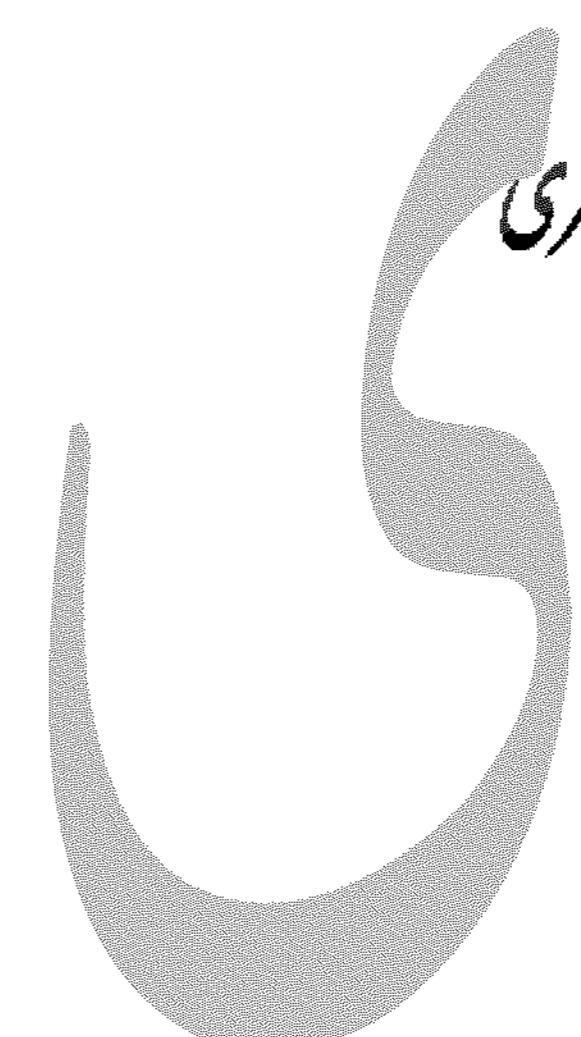
بس اِک آواز گونجے اور جہاں کا رُخ بدل جائے
نہ ممکن تھا، نہ ممکن ہے، مگر یہ معجزہ دیکھا!

وہ مسجد جس کی دیواریں تری خوشبو سے روشن ہیں
خوشا قسمت کہ میں نے اُس کی مٹی پر کیا سجدہ

ترے الطافِ بے حد سے نہیں رہتی کوئی مشکل
ترے دریائے رحمت سے نہیں پھرتا، کوئی پیاسا

ترے شہرِ مکرّم کی ہَوا میں سانس لیتے ہی
مرے سینے کا سارا بوجھ جیسے ہو گیا، ہلکا

ترے روضے کے گُنبد پر نظر جس وقت ٹھہری تھی
وُہی لمحہ کنارا تھا مرے دشتِ تمنّا کا

ازل سے تا اَبد امجدؔ دُرود اُس پر، سلام اُس پر
کہ جس نے آدمی کو آدمی کا مرتبہ بخشا

سلام

بھٹک رہی ہے زمیں پہ خلقِ خُدا ہراساں
کہ رہبری کا کمال دنیا سے اُٹھ گیا ہے
پھر اہلِ زر کی تونگری ہی نشانِ رُتبہ وجاہ ٹھہری
ہُنروری کا جمال دُنیا سے اُٹھ گیا ہے

تلاشِ رزقِ حلال کس کو ہو اور کیوں ہو؟
کہ جن کی آنکھوں میں تھی حیا وہ
چراغ مجرم بنے کھڑے ہیں
وہ جن کے سینوں میں روشنی تھی
وہ لوگ چپ چاپ بجھ گئے ہیں
سروں کو ہاتھوں پہ لے کے چلنے کے مدّعی ہیں ہزار لیکن
کسی کے رستے میں کربلا کا سفر نہیں ہے

کہاں گئے اے زمیں وہ راہِ وفا کے جویا؟
کہ لاکھ اہلِ نظر ہیں لیکن "نظر" نہیں ہے
میں منتظر ہوں ہَوا کے رستے میں اُس خبر کا
جو روشنی کا پیام لائے
میں منتظر ہوں گزرتے لمحوں میں اُس گھڑی کا
جو اِس سفر کے محیطِ غم میں کوئی سکوں کا مقام لائے!
زباں پہ کانٹے سے اُگ رہے ہیں
پھر آج شدّت وہ پیاس میں ہے
مرے وطن کی فضا عجب اِک ہراس میں ہے
حسینؓ، تیری تلاش میں ہے
یہ راہ بھولا ہُوا قبیلہ
حسینؓ، تیری تلاش میں ہے!

تو جو ہو گیا اُسے مان لے

کسی ہاتھ نے کسی لوح پر جو نہیں لکھا
وہی ایک حرفِ گُماں ہیں ہم!
خطِ گمشدہ میں لکھی گئی
کوئی اجنبی سی زباں ہیں ہم!
کسی اور خطّۂ درد پر جو گزر گیا
اُسی وقت کی تگ و تاز کا
کوئی بے نشاں سا نشاں ہیں ہم!
کبھی اپنے ہونے کے واہمے سے نکل کے دُنیا کو دیکھئے
تو نہ کھل سکے کہ کہاں ہیں ہم!

مری جاں، ہماری یہ داستاں
اِسی آسمان کی چھت تلے
اِنہی کہکشاؤں کے درمیاں
کئی لاکھ بار کہی گئی کئی لاکھ بار سُنی گئی
یہ حدیثِ نغمۂ بے صدا
کبھی سُرخ پھولوں کی تیز خوشبو میں رُک گئی
کبھی آنسوؤں میں رواں ہُوئی
یہ وہ شمعِ شامِ وصال ہے
جو تمام رات جلی کبھی
کبھی ایک پَل میں دُھواں ہوئی
کبھی روشنی کا یقیں بنی
کبھی تیرگی کا گُماں ہوئی۔

تو جو ہو گیا اُسے مان لے

کہ یہ داغ وہ ہیں جو سات بحروں
کے پانیوں سے نہ دُھل سکیں گے
کہ ایک تیرے نہ ماننے سے
یہ شہر بھر کی عمارتوں پہ
جو جلتے بجھتے حروف پہنے
شکستہ وعدے لٹک رہے ہیں
نہ جُڑ سکیں گے، نہ چُھپ سکیں گے!
ہَوا کے رستے میں اُڑنے والے اُداس پتّے
نہ رُک سکے ہیں نہ رُک سکیں گے۔

تو جو ہو گیا اُسے مان لے

⊛

★ ہمارے بعد ہیں کچھ لوگ کیسے، دیکھ تو آئیں
چلو اُس شہر کو اِک بار پھر سے، دیکھ تو آئیں

★ بہت دن سے سمندر کی ہَوا گُم سُم سی آتی ہے
نہ ہوں طوفان کے رُخ پر سفینے، دیکھ تو آئیں!

★ کسی دن آرزوؤں کے کھنڈر میں جھانک کر ہم بھی
در و دیوار پر کیا کیا ہیں جالے، دیکھ تو آئیں

★ ہَوا میں ڈولتی خوشبو، پتہ خود ہی بتا دے گی
چلو رستوں پہ تھوڑی دُور چل کے، دیکھ تو آئیں
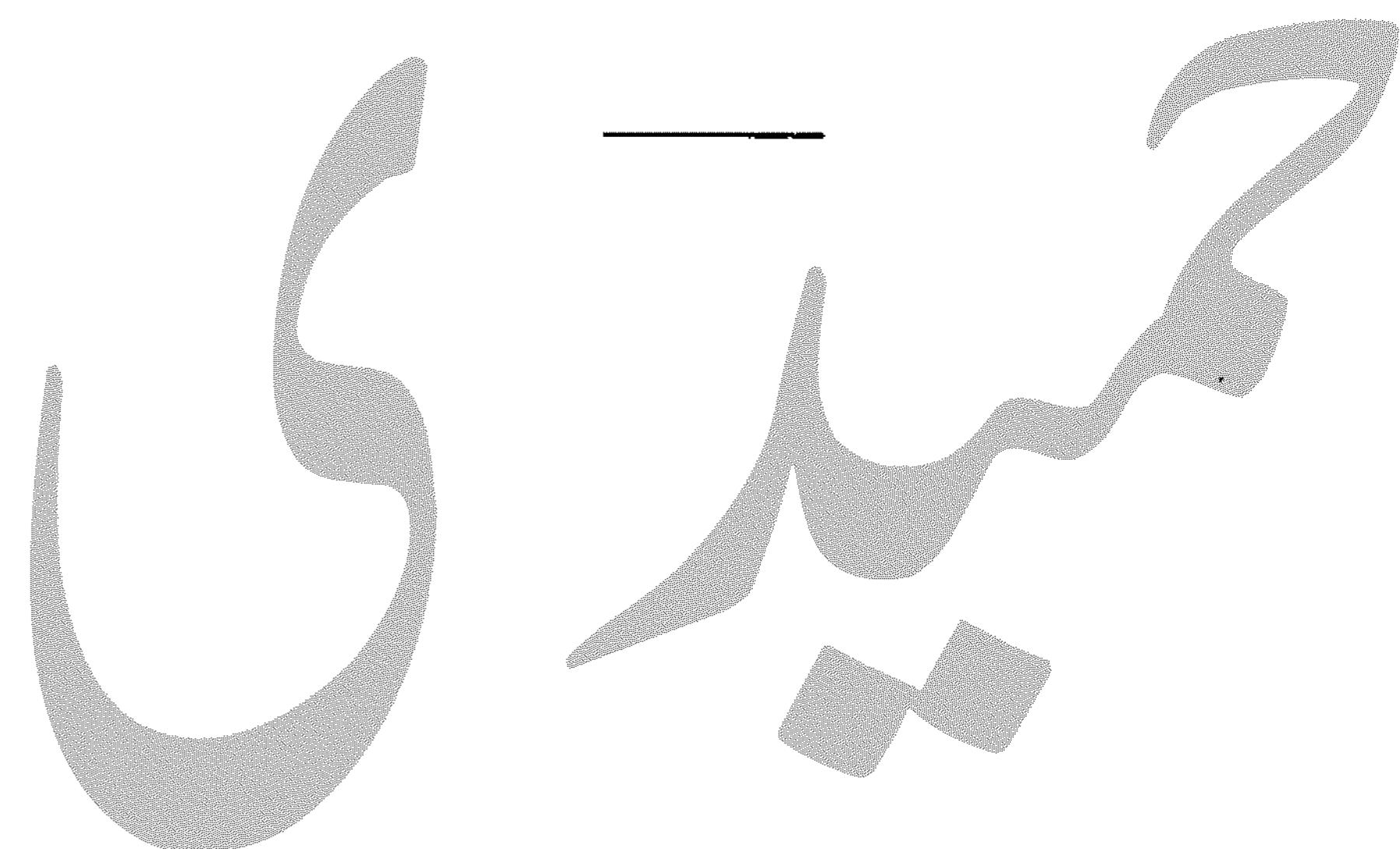
ہمارا نام سُنتے ہی کسی مہ وش کی آنکھوں میں
چمک اُٹھتے ہیں کیا اب بھی ستارے! دیکھ تو آئیں !

بہت دُھندلے سہی شیشے سرِ بزمِ وفا امجد
مگر اک بار وہ گُم گشتہ چہرے دیکھ تو آئیں

اے دِل

اے دل یہ تری وحشت کیا اور دکھائے گی !
کب تک اِنہی گلیوں میں بے سمت پھرائے گی !

کس موڑ پہ رُکنا ہے، کس راہ پہ جانا ہے
بتلا تو سہی ظالم، کس اَور ٹھکانا ہے

اِس شہرِ تذبذب میں، ہم بات کریں کیسے !
دن کاٹ کے حیراں ہیں، اب رات کریں کیسے !

اب تُم میرے نہیں رہے

میں جس شہر میں رہتا ہوں
وہ کہتا ہے
"اب تم میرے نہیں رہے"

سانس جو اب تک میری ہَوا میں تم نے لیے ہیں
لَوٹا دو
خواب جو میری مٹی کی خُوشبو میں جیے ہیں
دفنا دو
میرے رِزق کا لقمہ لقمہ
میرے جَل کا اِک اِک گھونٹ
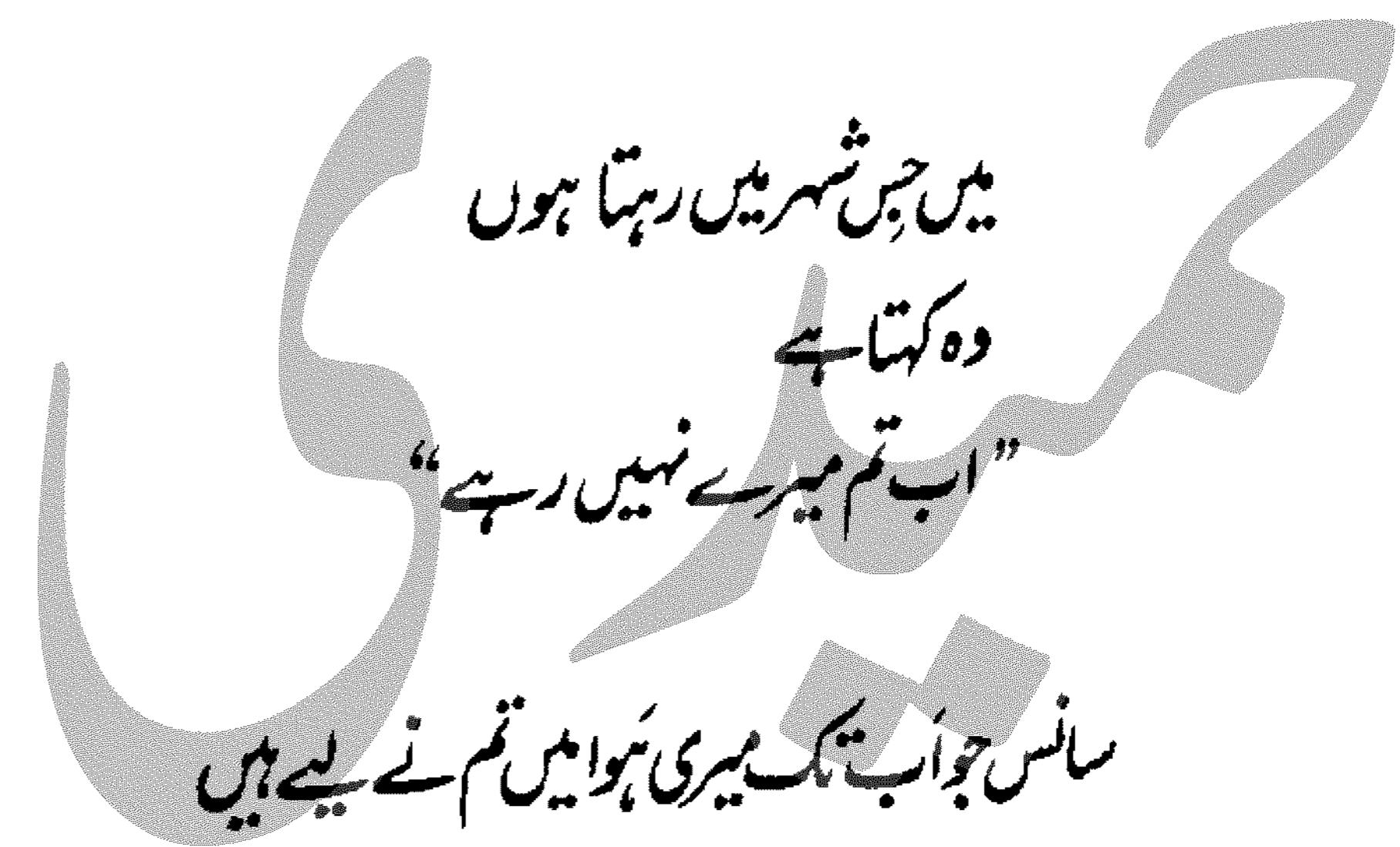
میری فضا میں اُڑنے والے پنکھ پکھیرو
اور اُن کی خوش رنگ صدائیں
ان سب سے اب ہاتھ اُٹھاؤ اور سُنو
تیز ہَوا کی سائیں سائیں

میرے اُوپر تَنی ہوئی افلاک کی چادر
اَبر کے سائے ، چاند کی کرنیں ، روشن تارے
نہیں تمھارے!

میرے شہر اے میرے پیارے
اتنے کڑوے بول یہ تُو نے
کیسے سوچے! کیسے کہے!
"اب تم میرے نہیں رہے"

آبِ حیات

(۱)

آتے جاتے موسموں کی لَوح پر
لکھے ہَواؤں نے،
بہت سے لفظ ایسے
جن کے معنی، اب کسی کو بھی نہیں آتے
کہ وہ گزرے زمانوں کے کسی انجان دوراہے پہ
رستہ بُھول بیٹھے تھے،

نتیجہ یہ ہوا کہ اب وہ ماضی میں تو زندہ ہیں
مگر کچھ اِس طرح جیسے

مشینوں کے توسط سے کوئی "کومے" میں زندہ ہو

کچھ ایسے لفظ بھی اِس لَوح پر لکھے ہُوئے ہیں
جن کے معنی اب نہیں ظاہر
مگر اِک وقت آئے گا
کہ یہ مفہوم کی پوشاک پہنیں گے
بلند آواز میں بولیں گے اور باتیں کریں گے!

(۲)

کبھی کے مر چکے اور آنے والے لفظ میں کیسا یہ رشتہ ہے!
کہ دونوں ایک ہی لمحے میں زندہ بھی ہیں ___ مُردہ بھی،
ہمارا کام تو بس لَوح کی خالی جگہوں پر
حاشیوں کی بالکونی سے
انھیں آواز دینا ہے
کہ یہ اپنی جگہ پر آکے بیٹھیں تو

ہماری بات بھی تحریر میں آئے !
ہمارے ہست کا منظر کسی تصویر میں آئے !

(۳)

ہمیں معلوم ہے اِک دِن
گزرتے وقت کی دیمک ہمیں بھی چاٹ جائے گی
کہ یہ اس کا وظیفہ ہے
یہ روشن دن جو نکلا ہے بہ آخر شام بھی ہوگا،
"وہ مہلت جو مِلی ہم کو، وہ کیسے بے ثمر نکلی !
وضاحت کون سُنتا ہے !
تلافی کس سے مانگیں ہم !"
ہمارے سر پہ اپنے خُون کا الزام بھی ہوگا۔
تو اس دیمک کا رِزقِ بے نشاں بننے سے پہلے
آخری حیلہ تو کر دیکھیں
جو کاغذ اپنے حِصّے کا ہے وہ کاغذ تو بھر دیکھیں

بہت مشکل سہی لیکن نہیں امکان سے باہر
کہ وہ الفاظ جن کے آج تک معنی نہیں ظاہر
ہم اُن کا بھید پا جائیں !
انھیں اِس لَوح پر لکھی ہُوئی تحریر کا حصّہ بنا جائیں،
اگر اُس موڑ سے پہلے،
جہاں اس بے جہت کاوش کو رزقِ خاک ہونا ہے
جہاں اِس زندگی کے قرض کو بے باق ہونا ہے
جہاں پر ہر بقا لمحہ، فنا پیغام بھی ہوگا
جہاں خورشید کا سایا شریکِ شام بھی ہوگا
اگر اُس موڑ سے پہلے
کسی صُورت،
ہم ان الفاظ کے پوشیدہ معنی جان پائیں تو
سمے کی لَوح پر لکھے ہُوئے کچھ خاص ناموں میں
ہمارا نام بھی ہوگا،
ہمارا کام بھی ہوگا۔

بدن سے اٹھتی تھی اُس کے خوشبو، صبا کے لہجے میں بولتا تھا
یہ میری آنکھیں تھیں اُس کا بستر، وہ میرے خوابوں میں جاگتا تھا

حیا سے پلکیں جھکی ہوئی تھیں، ہوا کی سانسیں رکی ہوئی تھیں
وہ میرے سینے میں سر چھپائے، نجانے کیا بات سوچتا تھا!

کوئی تھا چشمِ کرم کا طالب، کسی پہ شوقِ وصال غالب
سوال پھیلے تھے چار جانب، بس ایک میں تھا جو چپ کھڑا تھا

عجیب صحبت، عجیب رُت تھی، خموش بیٹھے ہوئے تھے دونوں
میں اُس کی آواز سن رہا تھا، وہ میری آواز سن رہا تھا

بہار آئی تو تتلیوں کے پروں میں رنگوں کے خواب جاگے
اور ایک بھنورا کلی کلی کے لبوں کو رہ رہ کے چومتا تھا!

وہ اور ہوں گے کہ جن کو امجد نئے مناظر کی چاہ ہوگی
میں اُس کے چہرے کو دیکھتا ہوں، میں اُس کے چہرے کو دیکھتا تھا!

یہ کون آج مری آنکھ کے حصار میں ہے!
مجھے لگا کہ زمیں میرے اختیار میں ہے

چراغِ رنگِ نوا، اب کہیں سے روشن ہو!
سکوتِ شامِ سفر، کب سے انتظار میں ہے

کچھ اس طرح ہے تری بزم میں یہ دل، جیسے
چراغِ شامِ خزاں، جشنِ نو بہار میں ہے

مری حیات کے سارے سفر پہ بھاری ہے
وہ ایک پل جو تری چشمِ اعتبار میں ہے

جو اُٹھ رہا ہے کسی بے نشان صحرا میں
نشانِ منزلِ ہستی اُسی غبار میں ہے

ہماری کشتیٔ دل میں بھی اب نہیں وہ زور
تمہارے حُسن کا دریا بھی اب اُتار میں ہے

کبھی ہے دُھوپ کبھی ابرِ خُوش نما امجدؔ
عجب طرح کا تلوّن مزاجِ یار میں ہے

WWW.PAKSOCIETY.COM

○

کوئی موسم ہو دل میں ہے تمھاری یاد کا موسم
کہ بدلا ہی نہیں جاناں تمھارے بعد کا موسم

نہیں تو آزما کر دیکھ لو، کیسے بدلتا ہے!
تمھارے مُسکرانے سے دلِ ناشاد کا موسم

صدا تیشے سے جو نکلی، دلِ شیریں سے اُٹھی تھی
چمن خسرو کا تھا لیکن رہا فرہاد کا موسم

پرندوں کی زباں بدلی کہیں سے ڈھونڈ لے تُو بھی
نئی طرزِ فغاں لے دل کہ ہے ایجاد کا موسم

رُتوں کا قاعدہ ہے وقت پر یہ آتی جاتی ہیں
ہمارے شہر میں کیوں رُک گیا فریاد کا موسم!

کہیں سے اُس حسیں آواز کی خوشبو پکارے گی
تو اُس کے ساتھ بدلے گا دلِ برباد کا موسم

قفس کے بام و دَر میں روشنی سی آئی جاتی ہے
چمن میں آگیا شاید لبِ آزاد کا موسم

مرے شہرِ پریشاں ہیں تری بے چاند راتوں میں
بہت ہی یاد کرتا ہوں تری بُنیاد کا موسم

نہ کوئی غم خزاں کا ہے نہ خواہش ہے بہاروں کی
ہمارے ساتھ ہے امجد کسی کی یاد کا موسم

چلیں ہم فرض کرتے ہیں

یہ کیسا کھیل ہے تقدیر کی بے نام بازی کا
کہ جو ہارے، سو ہارے ہیں
مگر جو جیت جاتے ہیں
انھیں بھی اِک نئی اُلجھن کی دَلدل گھیر لیتی ہے
کہ اِک مشکل کے بعد اِک اور مشکل گھیر لیتی ہے

سمجھنے کے لیے آئیں،
چلیں ہم فرض کرتے ہیں !
"کسی لمحے کسی اِک شخص کو پانا ہماری زندگی سے بھی زیادہ بیش قیمت تھا
ہم اُس کی آرزو میں ساری دُنیا بھول بیٹھے تھے
بس اُس کا نام لیتے تھے اُسی کو یاد کرتے تھے

اُسی کی دُھن میں جیتے تھے اُسی کے غم میں مرتے تھے۔
تو پھر کچھ یُوں ہوا اِک روز اُس کو پالیا ہم نے،
اُسے رنگوں کی ڈولی میں بٹھا کر گھر میں لے آئے
تصوّر کی ہر اِک خُوشبو گُلِ منظر میں لے آئے"
کہانی آگے چلتی ہے !
"تو ہوتا اِس طرح ہے۔ زندگی کے کارخانے میں
دِنوں کے آنے جانے میں
جہاں کے اَن گنت کاموں کا چکر چلنے لگتا ہے
بدن تھکتا ہے
آنکھیں دیر تک بیدار رہنے سے سُلگتی ہیں
زباں اِک تاجرانہ اور مسلسل جھُوٹ
کی تکرار سے اُکتانے لگتی ہے
مگر مجبور ہوتی ہے
کہ دُنیا کا دباؤ اُس کو رُکنے ہی نہیں دیتا
کوئی بے کار سا قصّہ وہ پھر دوہرانے لگتی ہے

تھکن اور نیند کی ملتی حدوں میں ، سرِ بستر پر
سحر سے رات تک کی بے نتیجہ گفتگو
یاد آنے لگتی ہے
تو اُس لمحے
وہ عمروں کی ریاضت کا ثمر، وہ گوہرِ یکتا
اُسی شکنوں بھرے بستر کے اِک حصے میں ہوتا ہے
مگر محسوس ہوتا ہے
کہ جیسے وہ ہزاروں میل کی دُوری پہ رہتا ہے
اِسی دُوری کے صحرا میں کئی راتیں بکھرتی ہیں
کئی دن فوت ہوتے ہیں ۔
تو پھر اک دِن
کسی بے نام سے احساس کی آہٹ
ہمارے ہست کی خالی گلی میں گونجتی ہے
اور ہمیں بیدار کرتی ہے، بتاتی ہے
کہ ہم جس گھر میں رہتے ہیں

وہاں کچھ خوبصورت خواب بھی آباد ہوتے تھے"

چلیں ہم فرض کرتے ہیں
یہ سب کچھ اِک کہانی ہے ،
مگر کتنی پرانی ہے !

کرو جو بات کرنی ہے

کرو جو بات کرنی ہے !
اگر اِس آس پہ بیٹھے ، کہ دُنیا
بس تمہیں سُننے کی خاطر
گوش بر آواز ہو کر بیٹھ جائے گی
تو ایسا ہو نہیں سکتا ،
زمانہ ، ایک لوگوں سے بھرا فٹ پاتھ ہے ، جس پر
کسی کو ایک لمحے کے لیے رُکنا نہیں ملتا ،
بٹھاؤ لاکھ تم پہرے ،
تماشا گاہِ عالم سے گزرتی جائے گی خلقت
بِنا دیکھے ، بِنا ٹھہرے ___

جسے تم وقت کہتے ہو ،
دھندلکا سا کوئی جیسے زمیں سے آسماں تک ہے !
یہ کوئی خواب ہے جیسے
نہیں معلوم کچھ اِس خواب کی مہلت کہاں تک ہے !
کرو ، جو بات کرنی ہے ___ !

○

کہیں سنگ میں بھی ہے روشنی کہیں آگ میں بھی دُھواں نہیں
یہ عجیب شہرِ طلسم ہے! کہیں آدمی کا نشاں نہیں
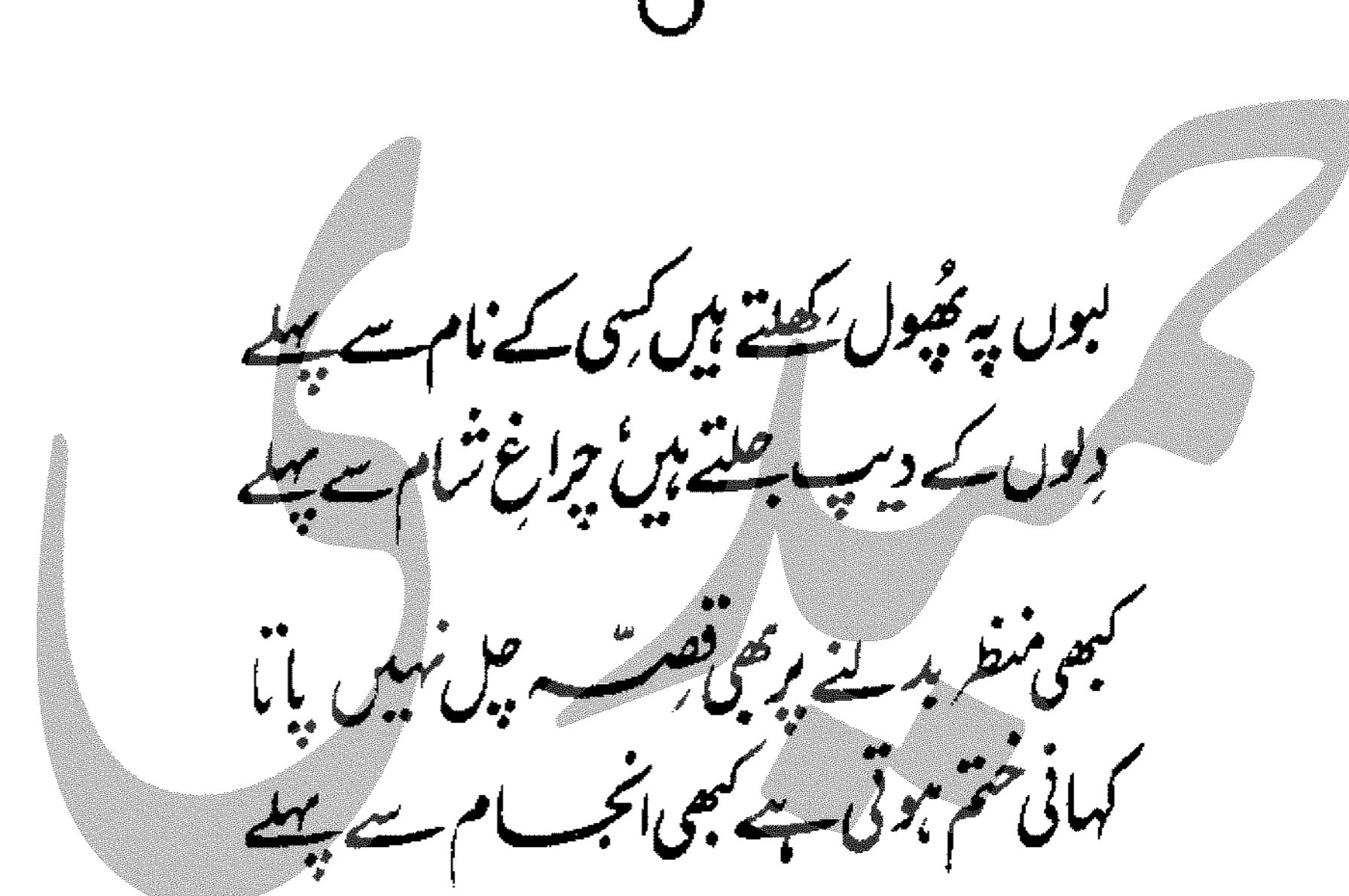
نہ ہی اس زمیں کے نشیب میں نہ ہی آسماں کے فراز پر
کٹی عمر اُس کو تلاشتے، جو کہیں نہیں پہ کہاں نہیں ؟

یہ جو زندگانی کا کھیل ہے، غم و انبساط کا میل ہے
اُسے قدر کیا ہو بہار کی! کبھی دیکھی جس نے خزاں نہیں

وہ جو کٹ گرے پہ نہ جُھک سکے، جو نہ مقتلوں سے بھی رُک سکے
کوئی ایسا سر نہیں دوش پر، کسی مُنہ میں ایسی زباں نہیں

جو تھے اشک میں نے وہ پی لیے، لبِ خشک و سوختہ بس سی لیے
مِرے زخم پھر بھی عیاں رہے، مِرا درد پھر بھی نہاں نہیں

نہیں اس کو عشق سے واسطہ وہ ہے اور ہی کوئی راستہ
اگر اس میں دِل کا لہو نہیں اگر اس میں جاں کا زیاں نہیں

○

لبوں پہ پھول کھلتے ہیں کسی کے نام سے پہلے
دِلوں کے دیپ جلتے ہیں، چراغِ شام سے پہلے

کبھی منظر بدلنے پر بھی قصّہ چل نہیں پاتا
کہانی ختم ہوتی ہے کبھی انجام سے پہلے

یہی تارے تمھاری آنکھ کی چلمن میں رہتے تھے
یہی سُورج نکلتا تھا تمھارے بام سے، پہلے!

دِلوں کی جگمگاتی بستیاں تاراج کرتے ہیں،
یہی جو لوگ لگتے ہیں نہایت عام سے، پہلے

ہوئی ہے شام جنگل میں، پرندے لوٹتے ہوں گے!
اب اُن کو کس طرح روکیں، نواحِ دام سے پہلے!

یہ سارے رنگ مُردہ تھے تمھاری شکل بننے تک
یہ سارے حرف مہمل تھے تمھارے نام سے پہلے

ہُوا ہے وہ اگر مُنصِف تو امجدؔ احتیاطاً ہم
سزا تسلیم کرتے ہیں کسی الزام سے پہلے

بے وفائی کی مُشکلیں

جو تُم نے ٹھان ہی لی ہے
ہمارے دِل سے نِکلو گے
تو اِتنا جان لو پیارے
وفا کی سیڑھیوں پر ہر قدم پھیلا ہوا
یہ آرزوؤں کا لہو ضائع نہ جائے گا
سمندر سامنے ہو گا اگر ساحل سے نِکلو گے !
ستارے، جن کی آنکھوں نے ہمیں اِک ساتھ دیکھا تھا ،
گواہی دینے آئیں گے !
پرانے کاغذوں کی بالکونی سے بہت سے لفظ جھانکیں گے
تمھیں واپس بُلائیں گے ،

کئی وعدے فسادی قرض خواہوں کی طرح رستے میں روکیں گے
تمھیں دامن سے پکڑیں گے
تمھاری جان کھائیں گے !
چُھپا کر کس طرح چہرہ
بھری محفل سے نِکلو گے !
ذرا پھر سوچ لو جاناں ،
نِکل تو جاؤ گے شاید
مگر مشکل سے نِکلو گے !

○

خزاں کی دُھند میں لپٹے ہوئے ہیں
شجر مجبوریاں پہنے ہوئے ہیں

یہ کیسی فصلِ گُل آئی چمن میں
پرندے خوف سے سہمے ہوئے ہیں

ہواؤں میں عجب سی بے کلی ہے
دِلوں کے بادباں سمٹے ہُوئے ہیں

ہمارے خواب ہیں مکڑی کے جالے
ہم اپنے آپ میں اُلجھے ہُوئے ہیں

دمکتے، گنگناتے، موسموں کے
لہو میں ذائقے پھیلے ہُوئے ہیں

مری صُورت، زمیں کے سارے منظر
ترے دیدار کو ترسے ہُوئے ہیں

مثالِ نقشِ پا، حیران تیرے!
ہُوا کی راہ میں بیٹھے ہُوئے ہیں

نگاہوں سے کہو، ہم کو سمیٹیں
مری جاں، ہم بہت بکھرے ہوئے ہیں

ادھوری خواہشوں کا غم نہ کرنا
کہ سارے خواب کب پُورے ہُوئے ہیں!

سمندر، آسماں اور سانس میرا
تری آواز پر ٹھہرے ہوئے ہیں

ہر اک رستے پہ کہتی ہیں یہ آنکھیں
یہ منظر تو کہیں دیکھے ہوئے ہیں!

ستارے آسماں کے، دیکھ امجد
کسی کی آنکھ میں اُترے ہُوئے ہیں

اے شعلۂ جاں ، دیکھ

کھلتے تھے جہاں چاند وہاں برف جمی ہے
تاروں سے تہی رات کی آنکھوں میں نمی ہے
کم کم ہیں دیئے اور بہت تیز ہوا ہے

ہیں اہلِ ہوس رونقِ ایوانِ تمنّا
کانٹوں کا ہُوا رزق خیابانِ تمنّا
غنچے ہیں پریشان ، گلوگیر صبا ہے

خوشبو کی زباں گنگ ہے، رنگوں کی نوا گم
منزل تو بڑی بات ہے، رستہ بھی ہوا گم
آشوب ہے ایسا کہ نہ دیکھا نہ سُنا ہے

ہے دُور، بہت دُور کہیں صُبح کا تارا
معدوم سہی ، دشتِ شبِ غم کا کنارا
لیکن یہی آشوب تو میزانِ وفا ہے!
اے دل یہ کڑا وقت ہی عرفانِ وفا ہے

اے شمعِ نظر، ضَو پہ تری حرف نہ آئے
اے شعلۂ جاں، دیکھ تری لَو نہ لرز جائے

---

* اشک آنکھوں میں آئے جاتے ہیں
پھر بھی ہم مسکرائے جاتے ہیں

دشتِ بے سائباں میں، ہم تیری
یاد کے سائے سائے جاتے ہیں

کوئی سُنتا نہیں کسی کی بات
اپنی اپنی سُنائے جاتے ہیں

قصرِ شاہی سے کب رُکے وہ سوال؛
جو سڑک پر اُٹھائے جاتے ہیں

ایسے جھکتی ہیں مہرباں آنکھیں
جیسے بادل سے چھائے جاتے ہیں

نہ سہی، زور گر ہوا پہ نہیں
ہم دیا تو جلائے جاتے ہیں

راستہ صاف ہو نہ ہو لیکن
ہم تو پتھر ہٹائے جاتے ہیں

ہم سُناتے ہیں حالِ دل اپنا
اور وہ مسکرائے جاتے ہیں

پھیلتی جا رہی ہے تنہائی
شہر میں لوگ آئے جاتے ہیں

پردے میں ایک مُسکراہٹ کے
کتنے آنسو چھپائے جاتے ہیں !

کون آیا ہے رُو برو امجد
آئنے جگمگائے جاتے ہیں

شہر کے بے نشان رستوں میں

شہر کے بے نشان رستوں میں ڈھونڈتی پھر رہی ہے رات کِسے ؟
جو ہَوا سے اُلجھ رہا تھا کبھی
وہ دِیا تو دیارِ وحشت میں
آپ اپنی ضیا کا رزق ہُوا
وقت کے بے یقین صحرا میں
حیرتِ بے صدا کا رزق ہُوا

راستے اجنبی ، فضا دشمن ، ہم کہیں جا کے اب یہ بات کِسے !
کس نے کرنا تھا روشنی کا سفر ، اور جلنا تھا کس کے ساتھ ، کِسے ؟
شہر کے بے نشان رستوں میں ، ڈھونڈتی پھر رہی ہے رات کِسے !

وہ دمکتی ہوئی لَو کہانی ہوئی وہ چمک دار شعلہ، فسانہ ہُوا
وہ جو اُلجھا تھا وحشی ہَوا سے کبھی، اُس دِیے کو بُجھے تو زمانہ ہُوا

ایک خوشبو سی پھیلی ہے چاروں طرف اُس کے امکان کی اُس کے اعلان کی
رابطہ پھر بھی اُس حسنِ بے نام سے، جس کا جتنا ہوا، غائبانہ ہُوا

باغ میں پھول اُس روز جو بھی کِھلا اُس کے بالوں میں سجنے کو بے چین تھا
جو ستارا بھی اُس رات روشن ہُوا، اُس کی آنکھوں کی جانب رَوانہ ہُوا

کہکشاں سے پرے آسماں سے پرے رہگزارِ زمان و مکاں سے پرے
مجھ کو ہر حال میں ڈھونڈنا تھا اُسے، یہ زمیں کا سفر تو بہانہ ہُوا

اب تو اُس کے دِنوں میں بہت دُور تک آسماں ہیں نئے اور نئی دُھوپ ہے
اب کہاں یاد ہو گی اُسے رات وہ جس کو گزرے ہُوئے اِک زمانہ ہُوا
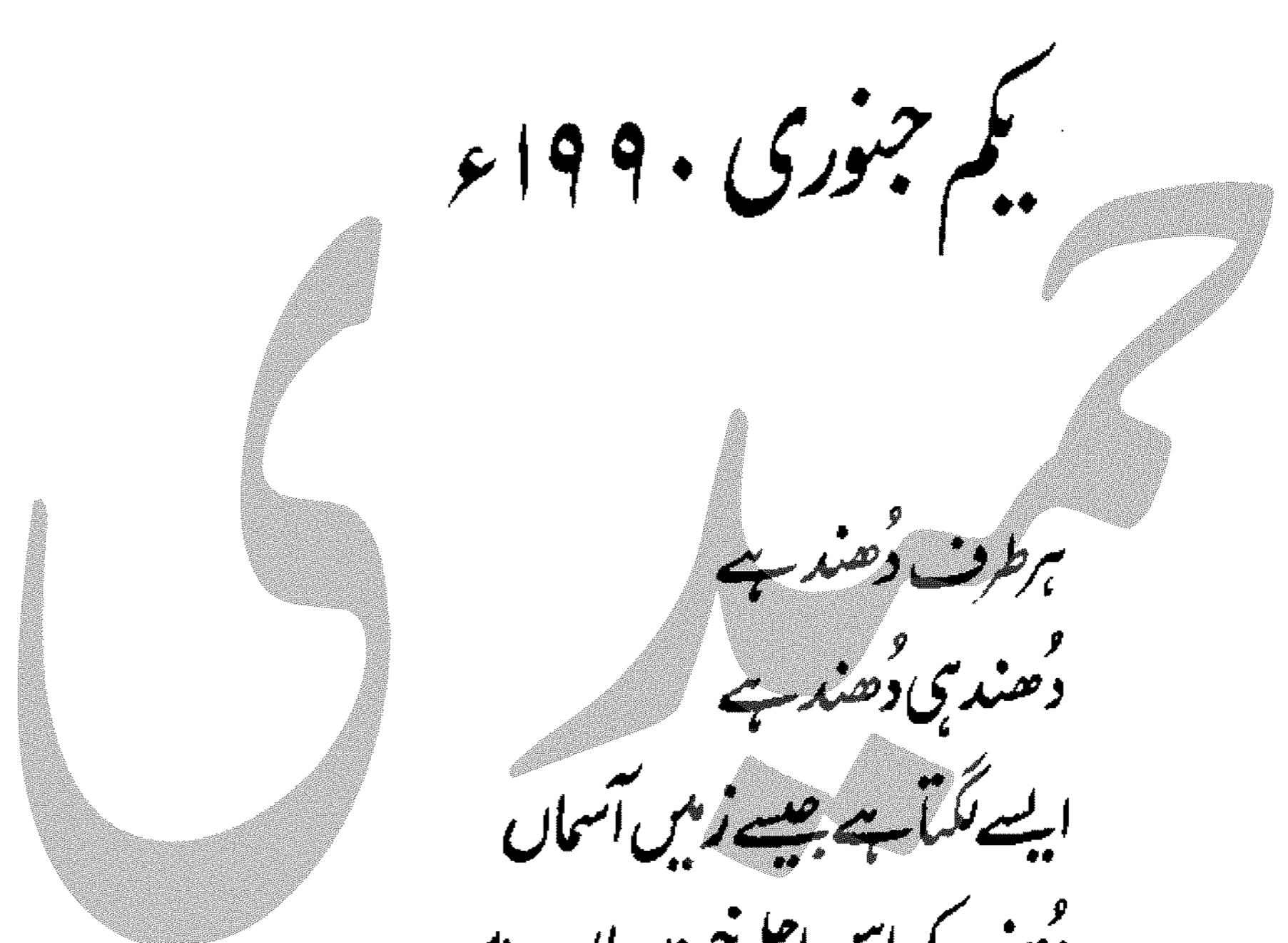
موسمِ وصل میں خُوب ساماں ہوئے، ہم جو فصلِ بہاراں کے مہماں ہوئے
گھاس، قالین کی طرح بچھتی گئی، سر پہ ابرِ رواں، شامیانہ ہُوا

اب تو امجد جُدائی کے اُس موڑ تک گرد کی دُھند ہے اور کچھ بھی نہیں
جانِ من، اب وہ دن لوٹنے کے نہیں، چھوڑیئے اب وہ قصّہ پرانا ہُوا

یکم جنوری ۱۹۹۰ء

ہر طرف دُھند ہے
دُھند ہی دُھند ہے
ایسے لگتا ہے جیسے زمیں آسماں
دُھند کے اِس اجل خیز سیلاب میں
خار و خس کی طرح
بہتے بہتے کہیں دُور کھو جائیں گے
وہ مناظر جو گنتی میں آتے نہ تھے
ایک ہو جائیں گے!

بے یقینی کے زنگوں میں اُلجھی ہوئی
چاندنی درد کی ، جگمگاتی نہیں !
دُھند کی جھیل پر تیرتی ہے مگر
راہ پاتی نہیں!
وہ نظر جو ستاروں کی ہمراز تھی
دس قدم دُور تک ساتھ جاتی نہیں
روشنی بھی کہیں کچھ دکھاتی نہیں!

آنکھ کہتی ہے" باہر بہت دُھند ہے"
دل یہ کہتا ہے" اندر بھی کم تو نہیں !"

میں گیا تھا اُس گلی میں ......

میں گیا تھا اُس گلی میں کئی خواہشیں پہن کر

وہ جو تھیں بہت شناسا
اُنہی کھڑکیوں سے اب کے
کسی رُخ کی روشنی سے نہ چراغ کوئی لرزا
نہ کوئی ستارا چمکا، نہ ہی پھول کوئی آیا
دلِ منتظر کی جانب
نہ اُٹھائی کوئی چلمن کسی دستِ پُرحنا نے
نہ صبا کی دستکوں سے کوئی پَردا سرسرایا
کسی خواب سے اُلجھ کر نہ تو چوڑیاں ہی چھنکیں
کسی آنکھ میں سمٹ کر نہ ہی چاند مُسکرایا

میں گیا تھا اُس گلی میں کئی خواہشیں پہن کر

ستارے ٹُوٹ کر جاتے کہاں ہیں؟

ستارے ٹُوٹ کر جاتے کہاں ہیں!
فلک کی شاخ سے جھڑتے ہوئے یہ اطلسی پتّے
زمیں کی سمت آتے ہیں تو ان کی آخری سانسیں
دمکتی اور چمکتی روشنی کے
لہریوں کی شکل چلتی ہیں
بظاہر ایسا لگتا ہے
"وہاں"
بستی کے اُس جانب، کسی جنگل کی وسعت میں،
کسی پربت کے سینے پر
گرا ہوگا کہیں ملبہ،
اُسی خوش رنگ تارے کا
جو اب سے ثانیہ بھر قبل روشن تھا

چمکتا تھا، دمکتا تھا، فلک پر جگمگاتا تھا
(مگر اب اُس کے ہونے کی نشانی تک نہیں ملتی)

نظر حیران ہوتی ہے
کہ جو کوندا سا لپکا تھا
اُسے اب کِس طرح ڈھونڈے! کہاں ڈھونڈے!
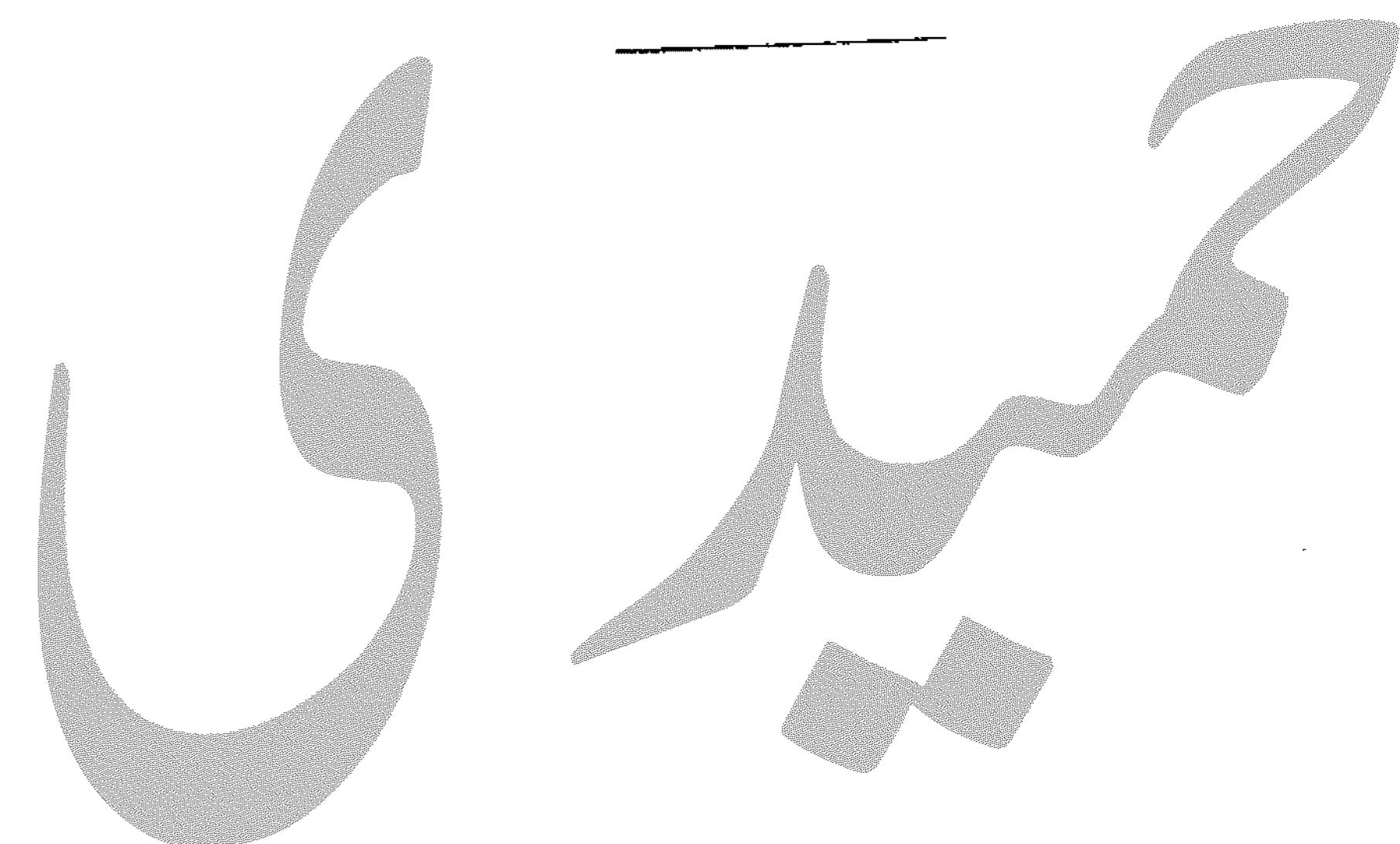
خلا اندر خلا اِک خامشی ہے اور دہشت ہے
ستاروں کی گزرگاہوں میں بس وحشت ہی وحشت ہے!
نظر کے واہمے ہیں یا گماں ہیں!
کچھ نہیں کھُلتا
ستارے ٹوٹ کر جاتے کہاں ہیں!
کچھ نہیں کھُلتا!!

⊛

کِسی کی دُھن میں جینا ہے، کِسی کے ڈر میں رہنا ہے
بتا اے زندگی کب تک اِسی چکّر میں رہنا ہے!

دھنک بُنیاد تھی جن کی وہ بام و دَر نہ بن پائے
تذبذب نام ہے جس کا ہمیں اُس گھر میں رہنا ہے

تمنّا اور حسرت میں ہے فرق اظہار کا، یعنی
جو شعلہ جل نہیں سکتا اُسے پتھر میں رہنا ہے

ترے باغِ توجّہ کی فضا میں زندگی کرنا
رَمِ خوشبو میں چلنا ہے گُلِ منظر میں رہنا ہے

کہانی ایک ہے لیکن، جُدا ہیں واقعے اپنے
تمھیں محشر اُٹھانا ہے ہمیں محشر میں رہنا ہے

تمنّا نے ہمیں پایا، تغافل اُن کو راس آیا
کہ ہر احساس کو امجد کسی پیکر میں رہنا ہے

جانِ جاں کیا کریں ؟

جانِ جاں کیا کریں ؟
"جو مہ و سال گزرے ہیں اُن کو نہ گزرے ہوئے فرض کرلیں !
سمجھ لیں کہ موسم ابھی اپنے ہاتھوں سے نکلے نہیں
راستے، سُرخ پھُولوں سے مہکے ہوئے ہیں
ہوا، ساحلوں پر ہماری امانت سنبھالے ہوئے
چل رہی ہے، ستارے
ہمیں دیکھ کر مسکراتے ہیں
ہونٹوں پہ کِھلتے ہیں، آنکھوں میں سجتے ہیں
سانسوں میں چلتے ہوئے جگمگاتے ہیں !
یہ فرض کرلیں،
کہ لفظوں کے معنی ابھی تک وہی ہیں

تمنّا کے انداز بدلے نہیں ،
جو شب و روز گزرے ہیں ___ گزرے نہیں"

(۲)
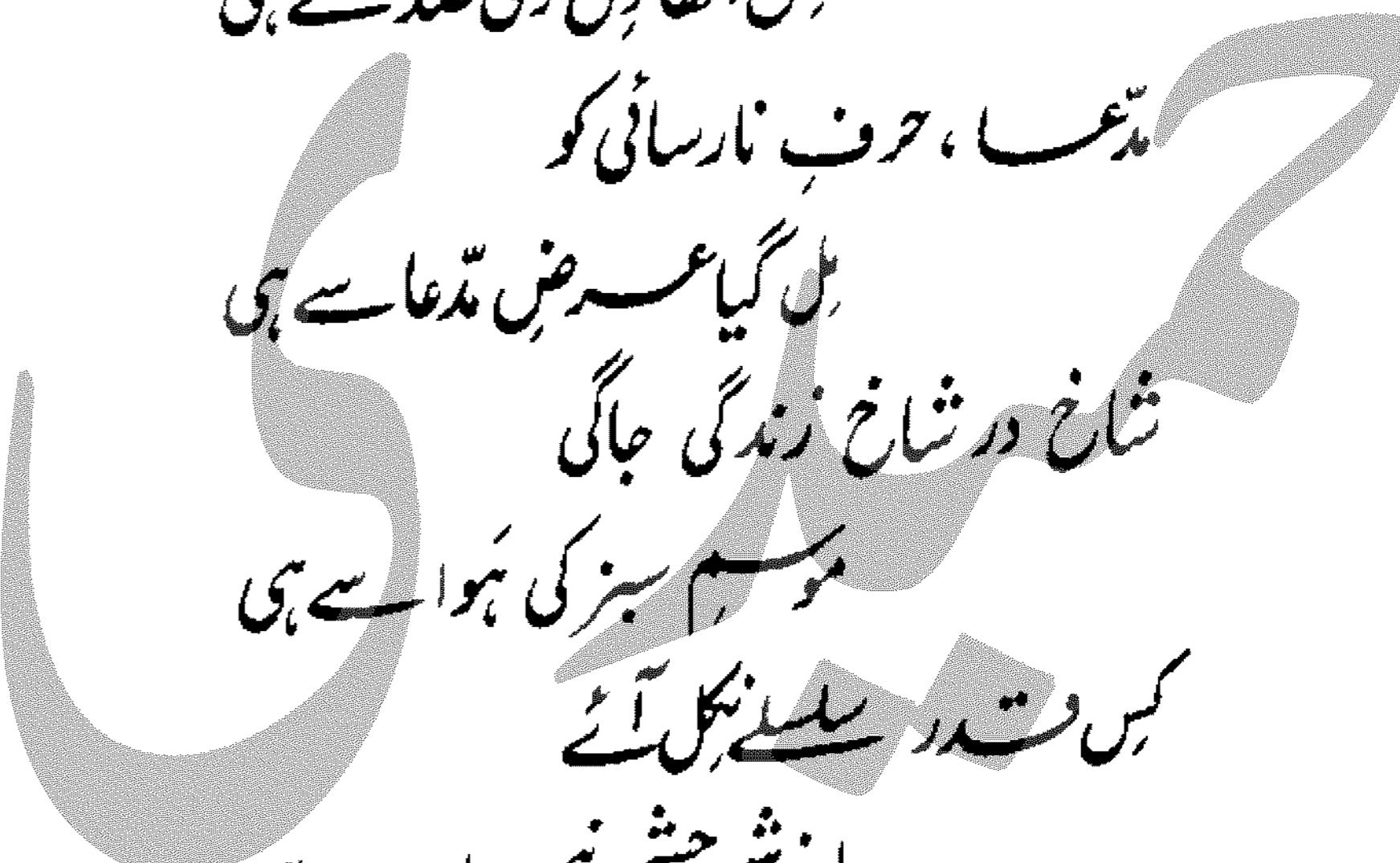
کیا کریں جانِ جاں !
جو عبارت ہواؤں پہ تحریر ہے
فرض کیسے کریں !
یہ جو لمحوں کی اُلجھی سی زنجیر ہے
اِس سے کیسے بچیں !
جو بھی کچھ ہو چکا ___ ہو چکا جانِ جاں ،
جو شب و روز تیری مری زندگی کے کناروں کو چھوتے ہوئے جا چکے
اُن کو ڈھونڈیں کہاں اور چھپائیں کہاں !
کیا کریں جانِ جاں ___ !
نارسائی کے صحرا میں جو کٹ گئے
وقت کی لَوح پر اُن مہ و سال کا

ثانیہ ثانیہ ماجرا درج ہے !

گردِ بادِ زماں کے خم و پیچ سے
راستہ کوئی باہر کو جاتا نہیں !
خواہشوں کے بچھائے ہوئے جال میں
خواہشوں کے سوا کچھ بھی آتا نہیں !
جانِ جاں کیا کریں !
کیا کریں جانِ جاں !!

○

ایک احساسِ دل کُشا سے ہی
کھِل اُٹھا دِل تری صدا سے ہی

مدّعا ، حرفِ نارسائی کو
مِل گیا عرضِ مدّعا سے ہی

شاخ در شاخ زندگی جاگی
موسمِ سبز کی ہَوا سے ہی

کس قدر سلسلے نکل آئے
لرزشِ چشمِ نیم وا سے ہی

پھول سے رُت ہے، باغباں سے نہیں
اپنا شکوہ تو ہے صبا سے ہی

رسم یہ حق پہ جان دینے کی
ہم نے سیکھی ہے کربلا سے ہی

خود جیئو ، دُوسروں کو جینے دو
اپنی عادت ہے یہ سدا سے ہی

ہُنر و مرتبہ نہیں مخصوص
جُبّہ و خلعت و قبا سے ہی

کتنے ہی بے جہت نہ کیوں ہو جائیں!
اپنا رِشتہ تو ہے خُدا سے ہی

سینکڑوں بار مِل چکے ہوتے
آپ مِلتے اگر دُعا سے ہی!

دَرد کی آبرو نہیں رہتی
نیّتِ حرفِ التجا سے ہی

وہ دورا ہا بھی آگیا امجد
جس کا دھڑکا تھا ابتدا سے ہی

مُنیر احمد شیخ کے لیے کچھ پھُول

اے خدا،

یہ ترا مال تھا تُو نے واپس لیا

ہم جو اس موسمِ گُل کی یادوں میں ہیں

تیرے دربار میں سر جھکائے ہُوئے

کرتے ہیں التجا،

اس لحد کے مکیں پر کُشادہ رہے

تیری رحمت سدا

اے خُدا ___ اے خُدا

ایک سوگوار نظم

(مُنیر احمد شیخ کے لیے)

جتنے موسم ترے ساتھ گزرے

نجانے ترے واسطے اُن کی صورت ہے کیا!

جو تجھے یاد کرتے ہیں، اُن کے لیے

اب خزاں کے سوا کوئی موسم نہیں ۔

ہم تھے، ہمارے ساتھ کوئی تیسرا نہ تھا
ایسا حسین دن کہیں دیکھا سُنا نہ تھا

آنکھوں میں اُس کی تیر رہے تھے حیا کے رنگ
پلکیں اُٹھا کے میری طرف دیکھتا نہ تھا

کچھ ایسے اُس کی جھیل سی آنکھیں تھیں ہر طرف
ہم کو سوائے ڈوبنے کے راستہ نہ تھا

ہاتھوں میں دیر تک کوئی خُوشبو بسی رہی
دروازۂ چمن تھا وہ بندِ قبا نہ تھا
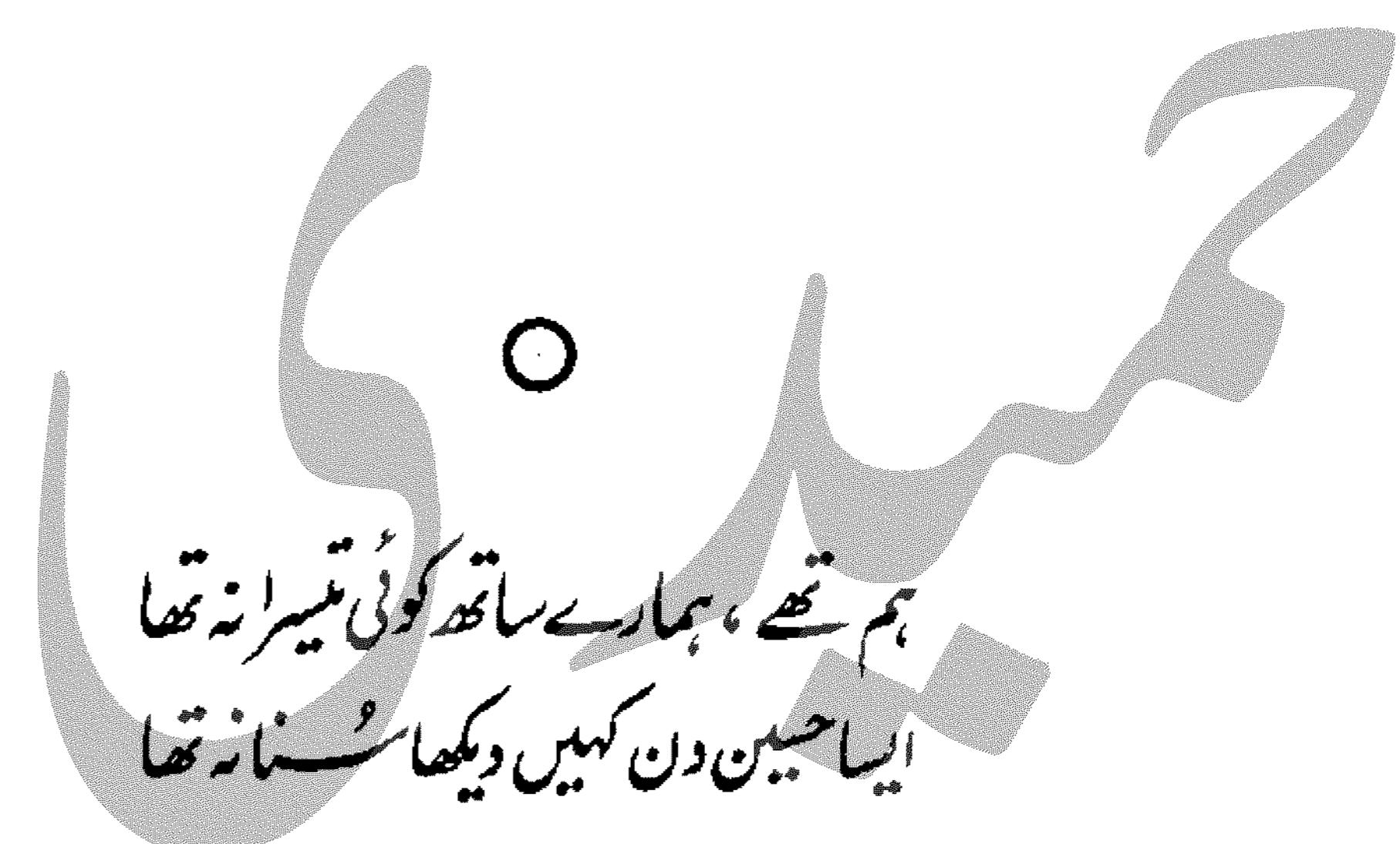
اُس کے تو انگ انگ میں جلنے لگے دِیے
جادُو ہے میرے ہاتھ میں مجھ کو پتا نہ تھا

اُس کے بدن کی لَو سے تھی کمرے میں روشنی
کھڑکی میں چاند، طاق میں کوئی دیا نہ تھا

کل رات وہ نگار ہُوا ایسا مُلتفت
عکسوں کے درمیان کوئی آئنہ نہ تھا

سانسوں میں تھے گلاب تو ہونٹوں پہ چاندنی
ان منظروں سے میں تو کبھی آشنا نہ تھا

رویا کچھ اس طرح مرے شانے سے لگ کے وہ
ایسے لگا کہ جیسے کبھی بے وفا نہ تھا

ہے عشق ایک روگ محبت عذاب ہے
اِک روز یہ خراب کریں گے، کہا نہ تھا!

امجدؔ وہاں پہ حد کوئی رہتی بھی کس طرح
رُکنے کو کہہ رہا تھا مگر روکتا نہ تھا

کوئی کسی اور کے خوابوں میں کیسے زندہ رہ سکتا ہے!

یہ جان کر بھی
کہ سارے انساں بس اپنے خوابوں میں زندہ رہتے ہیں
اور اپنے اخیر دم تک اُنھی کے چہرے نکھارتے ہیں
انھی میں ہنستے، انھی میں بستے، انھی میں سجتے، سنوارتے ہیں
یہ جانتے ہیں
بہت ہی اچھی طرح سے یہ بات جانتے ہیں
کہ جس کی آنکھوں میں جتنے سپنے ہیں
اُس کے اپنے ہیں،
پھر بھی کیسا عجب ہے قصّہ
کہ ہر کوئی اپنے اپنے خوابوں کو، خواہشوں کو
کسی کی آنکھوں میں دیکھتا ہے

ہیں اپنے چہرے کے نقش جن کو
وہ اور چہروں میں ڈھونڈتا ہے ،
ہے باپ جو بھی ، وہ چاہتا ہے کہ اُس کا بیٹا
جہاں کو اپنی بجائے اُس کی نظر سے دیکھے
اور اُس کی آنکھوں میں خواب جتنے بھی گھر بنائیں
سبھی کے دروازوں کی جبیں پر
بس اُس کے حرفوں سے بننے والے اِک اسمِ دائم کی تختیاں ہوں
وہ اپنی آنکھوں سے "اُس" کی آنکھوں کے خواب دیکھے ،
اُسی کے سوچے محل بنائے اُسی کے دیکھے سراب ، دیکھے
یہ جان کر بھی ....
یہ جان کر بھی ۔

○

قاصد جو تھا بہار کا نامعتبر ہُوا
گلشن میں بندوبست برنگِ دِگر ہُوا

خواہش جو شاخِ حرف پہ چٹکی، بکھر گئی
آنسو جو دِل میں بند رہا ، وہ گُہر ہُوا

اِک منحرف گواہ کی صُورت ، چراغِ شام
اُس کی گلی میں رات مرا ہم سفر ہوا

آواز کیا کہ شکل بھی پہچانتا نہیں
غافل ہمارے حال سے وہ اِس قدر ہوا

عُمرِ رواں کے رَخت میں ایسا نہیں کوئی
جو پَل تمہاری یاد سے باہر، بسر ہُوا

خوشبو تھی جو خیال میں، رزقِ اَلم ہُوئی
جو رنگِ اعتبار تھا، گردِ سفر ہُوا

دل کی گلی میں حدِ نظر تک تھی روشنی
کرنیں سفیر، چاند ترا نامہ بر ہُوا

تارے مرے وکیل تھے، خوشبو مری گواہ
کل شب عجب معاملہ، پیشِ نظر ہُوا

امجدؔ اگر وہ دورِ جنوں جا چکا، تو پھر
لہجے میں کیوں یہ فرق کسی نام پر ہُوا!

یہ اب جو موڑ آیا ہے

یہ اب جو موڑ آیا ہے
یہاں رُک کر کئی باتیں سمجھنے کی ضرورت ہے
کہ یہ اس راستے کا ایک حصّہ ہی نہیں، سارے
سفر کو جانچنے کا، دیکھنے کا، تولنے کا
ایک پیمانہ بھی ہے، یعنی
یہ ایسا آئنہ ہے
جس میں عکسِ حال و ماضی اور مستقبل
بہ یک لمحہ نمایاں ہے
یہ اُس کا استعارہ ہے
جو اپنی منزلِ جاں ہے

سُنا ہے ریگِ صحرا کے سفر میں
راستے سے دو قدم بھٹکیں
تو منزل تک پہنچنے میں کئی فرسنگ کی دُوری نکلتی ہے
سو اَب جو موڑ آیا ہے
یہاں رُک کر کئی باتیں سمجھنے کی ضرورت ہے
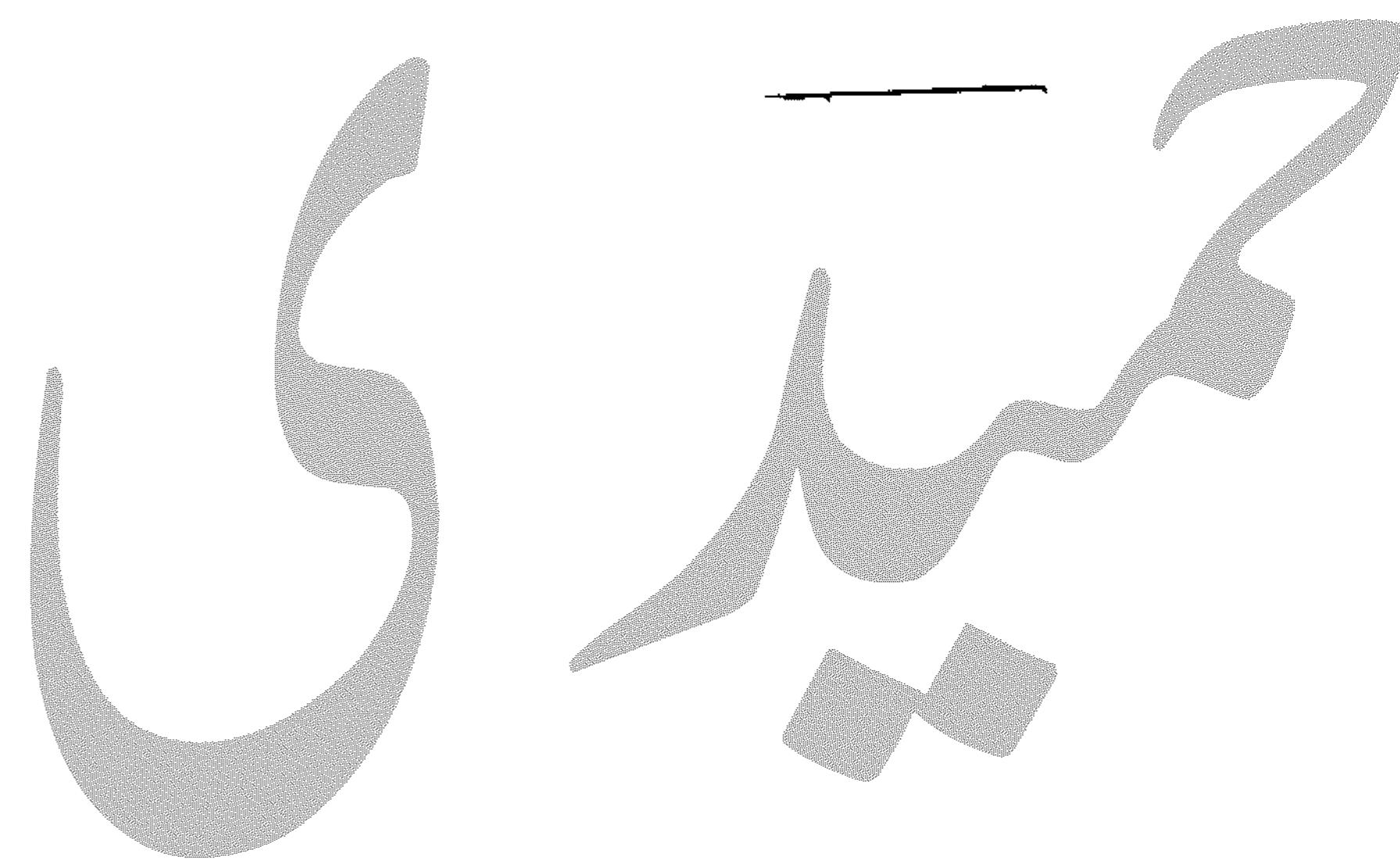
سُورج! تیری آگ بُجھے گی کتنے پانی سے؟

سوچ رہی ہے جانے کب سے آدم کی اولاد
ایک ہی بیج سے جب یہ اتنے ڈھیروں پیڑ اُگے
ایک ہی پیڑ کی شاخ شاخ پہ مہکے جو سب پھُول
ایک ہی پھُول کے دامن میں جو سارے رنگ بھرے
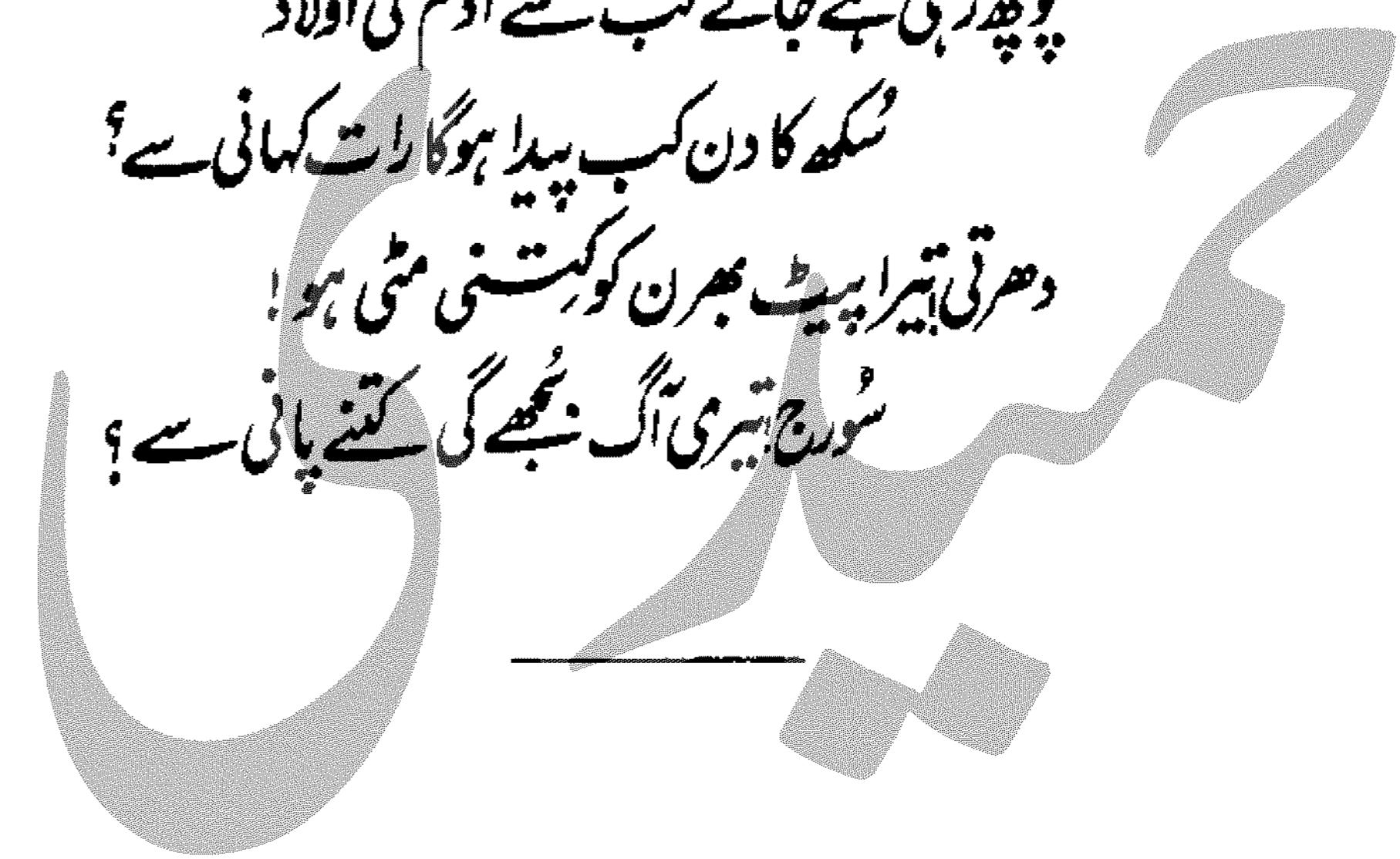
پھر یہ کیسا فرق ہے ان میں، کیسا ہے اُلجھاؤ!
ایک ہی پھُول کی ہر پتّی میں دُنیا ایک نئی
ایک ہی شاخ پہ کھِل اُٹھتے ہیں کیسے کیسے پھُول!
ایک ہی پیڑ پہ مل جاتے ہیں باہم رنگ کئی

لیکن ان کے میل میں بھی ہے اک دُوری موجود
کھا جاتے ہیں زرد و سیہ کو سُرخ اور گہرے رنگ
زور آور سے دب جاتے ہیں، جتنے ہیں کمزور
طاقت والے ہو جاتے ہیں طاقتور کے سنگ

پُوچھ رہی ہے جانے کب سے آدم کی اولاد
سُکھ کا دن کب پیدا ہو گا رات کہانی سے؟
دھرتی تیرا پیٹ بھرن کو کتنی مٹی ہو!
سُورج تیری آگ نہ بُجھے گی کتنے پانی سے؟

بیت المقدس کی ایک شام

بہت سال گزرے
اِسی شہرِ اقدس میں اِک شام ایسی بھی روشن ہوئی تھی
کہ جس کے جلو میں ستاروں کا اِک کارواں بھی رواں تھا
اور اُس کا سفر، آنے والی کئی
چاند آباد صدیوں پہ سایہ کناں تھا

پھر ایسا ہُوا، روشنی کم ہوئی
اور آہستہ آہستہ ظلمت کی چادر نے اس شہرِ اقدس پہ پردہ کیا
اور آنکھوں کے سب طاق ویراں ہوئے

جن چراغوں کی لَو سے ہَوا بدگماں تھی
خود اپنے لیے مرگ ساماں ہُوئے
اور بجھتے ہوئے آنسوؤں کی نمی نذرِ جاں کر گئے
اور چاروں طرف اِک دُھواں کر گئے

وہ دیوارِ گریہ
جو ظلمت فروشوں کا نقشِ فغاں تھی
ہمارے اَلَم کا نشاں بن گئی
بے بسی اور ہزیمت ہمارے سفر کی زباں بن گئی
وہ حزیران کا موسمِ بے نمو، عزم کی کھیتیاں ساتھ لیتا گیا
ایک سیلِ بلا کتنی ہی بستیاں ساتھ لیتا گیا

میں اُس شہرِ اقدس کے باہر کھڑا ہوں
کہ جس کی فصیلوں میں میرے لہو کے دیے جل رہے ہیں
ہوا تیز چلنے لگی ہے

سپاہی نے دروازے پر قفل ڈالا ہے
بندوق لہرا کے مجھ سے کہا ہے
"چلو، شام ہونے لگی ہے، چلو، اپنی بستی میں جاؤ
کہ یہ شہرِ اقدس تمہارے لیے شہرِ ممنوع ہے"

اور میں سوچتا ہُوں
درِ شہرِ اقدس کے باہر کھڑا میں یہی سوچتا ہوں
کہاں تک یہ ذلّت کی اور غم کی آتش
مرے دِل ہی دِل میں سُلگتی رہے گی!
گھنی شام کی یہ گھنیری اُداسی
کہاں تک مرے ساتھ چلتی رہے گی!

چاند مری کھڑکی میں آئے

چاند کبھی تو تاروں کی اِس بھیڑ سے نکلے
اور مری کھڑکی میں آئے
بالکل تنہا اور اکیلا
میں اُس کو باہوں میں بھر لوں
ایک ہی سانس میں سب کی سب وہ باتیں کروں
جو میرے، تالو سے چمٹی
دل میں سمٹی رہتی ہیں
سب کچھ ایسے ہی ہو جائے، جب ہے نا۔
چاند مری کھڑکی میں آئے، تب ہے نا!

سادہ سے اِک چہرے پر

سادہ سے اِک چہرے پر کیا جادُوگر سی آنکھیں ہیں!
جو دیکھے اِن کا ہو جائے
جو اُترے وہ تھاہ نہ پائے
کتنے سپنے جاگ رہے ہیں
اِن پلکوں کے سائے سائے
شمعِ سحر سی، چارہ گر سی، نامہ بر سی آنکھیں ہیں!
اَنجانی، پہچانی بھی
اپنی اور بیگانی بھی
ایک ہی منظر کا حصّہ ہیں!
عکس بھی اور حیرانی بھی
ساحل جیسی لگتی ہیں وہ اور بھنور سی آنکھیں ہیں
سادہ سے اِک چہرے پر کیا جادوگر سی آنکھیں ہیں

ہم کو ہے تیری نظر میں رہنا

خواب بھی ایک مسافر کی طرح ہوتے ہیں
چشم در چشم سدا ان کو سفر میں رہنا
رنگ کی موج میں، خوشبو کے اثر میں رہنا
ان کی عادت ہی نہیں
ایک جگہ پر رُکنا
ان کی قسمت ہی نہیں
ایک نگر میں رہنا

ہم بھی اِک خواب ہیں اے جان، تری آنکھوں میں
چند لمحوں کو جو ٹھہریں تو ہمیں
اپنی پلکوں کی اماں میں رکھنا
سایۂ ابرِ توجہ کے گماں میں رکھنا

دھیان کے طاق سے ہم کو نہ ہٹانا، جب تک
رات کے بام پہ تاروں کے دیے جلتے رہیں
دیکھنا ہم کو، ہمیں دیکھتے جانا، جب تک
ہم تری آنکھ کی وادی میں سفر کرتے رہیں
خواب کا شوق یہی، خواب کی قسمت بھی یہی
حلقۂ ریگِ رواں، گردِ سفر میں رہنا
رنگ کی موج میں، خوشبو کے اثر میں رہنا
ہم مگر خواب ہیں کچھ اور طرح کے، ہم کو
نہ کوئی شوقِ سفر ہے نہ تلاشِ خوشبو
تیری آنکھوں میں جلیں اور انہی میں بجھ جائیں
چشم در چشم نہیں ہم کو سفر میں رہنا!
ہم کو ہے تیری نظر میں رہنا۔

○

ویرانۂ وجود میں چلنا پڑا ہمیں
اپنے لہو کی آگ میں جلنا پڑا ہمیں

منزل بہت ہی دُور تھی، رستے تھے اجنبی
تاروں کے ساتھ ساتھ نکلنا پڑا ہمیں

سایا مثال آئے تھے اُس کی گلی میں ہم
ڈھلنے لگی جو شام تو ڈھلنا پڑا ہمیں

اپنے کہے سے وہ جو ہوا منحرف، تو پھر
اپنا لکھا ہُوا بھی بدلنا پڑا ہمیں

محرابِ جاں کی شمعیں بچانے کے واسطے
ہر رات کنجِ غم میں پگھلنا پڑا ہمیں

ہم چڑھتے سُورجوں کو سلامی نہ دے سکے
سُو دوپہر کی دھوپ میں جلنا پڑا ہمیں

تھا ابتدا سے علم کہ ہے راستہ غلط
اور قافلے کے ساتھ بھی چلنا پڑا ہمیں

شانے پہ اس اَدا سے رکھا پھر کسی نے ہاتھ
دل مانتا نہ تھا پہ بہلنا پڑا ہمیں

امجد کسی طرف بھی سہارا نہ تھا کوئی
جب بھی گرے تو خود ہی سنبھلنا پڑا ہمیں

کاش کبھی تو ایسے ہو!

آنکھیں دیکھیں خواب،
آنکھیں دیکھیں اور کسی کے خواب ،
اپنی آنکھیں ہی جب دیکھیں اور کسی کے خواب ،
کون بُنے پھر خواب ہمارے، شکوے کون سُنے !
کانٹے کون چُنے !
دل کو ہے بس ایک ہی اُلجھن ،
"من چاہی تعبیر سے روشن سپنا ، کیسے ہو ؟
آنکھوں میں جو خواب بسا ہے ، اپنا ، کیسے ہو!"

تم دیکھو اِک خواب ،
اپنی آنکھوں سے تم دیکھو میرا خواب ،
اپنی آنکھوں سے تم دیکھو کاش کبھی اک میرا خواب ،
شکووں کی پرچھائیاں اوڑھے، مجھ سے کرو پھر بات ،
مجھ سے کرو یہ بات
دل کو ہے بس ایک ہی اُلجھن ،
من چاہی تعبیر سے روشن، سپنا کیسے ہو!
آنکھوں میں جو خواب ترا ہے "اپنا" کیسے ہو!

○

سرِ طاقِ جاں نہ چراغ ہے پسِ بامِ شب نہ سحر کوئی
عجب ایک عرصۂ درد ہے، نہ گماں ہے نہ خبر کوئی

نہیں اب تو کوئی ملال بھی کسی واپسی کا خیال بھی
غمِ بے کسی نے مٹا دیا مرے دل میں تھا بھی اگر کوئی

تجھے کیا خبر ہے کہ رات بھر تجھے دیکھ پانے کو اِک نظر
رہا ساتھ چاند کے منتظر تری کھڑکیوں سے اُدھر کوئی

سرِ شاخِ جاں ترے نام کا عجب ایک تازہ گلاب تھا
جسے آندھیوں سے خطر نہ تھا جسے تھا خزاں کا نہ ڈر کوئی

تری بے رُخی کے دیار میں، گھنی تیرگی کے حصار میں
جلے کس طرح سے چراغِ جاں! کرے کس طرف کو سفر کوئی!

کٹے وقت چاہے عذاب میں کسی خواب میں یا سراب میں
جو نظر سے دُور نکل گیا اُسے یاد کرتا ہے ہر کوئی

سرِ بزم جتنے چراغ تھے وہ تمام رمز شناس تھے
تری چشمِ خوش کے لحاظ سے نہیں بولتا تھا مگر کوئی

---

(۴۲)

شام بجھتی، چراغ جلتا رہا
قافلہ، زندگی کا چلتا رہا

شاد تھا رنجِ رہگزر میں کوئی!
کوئی منزل پہ ہاتھ ملتا رہا

دھوپ تھی جس نگر میں، کم نہ ہوئی
سایۂ آفتاب، ڈھلتا رہا

بجھ گئے تھے، دیے بھی، تارے بھی
اِک مرا خواب تھا کہ جلتا رہا

آئینے بھی نہ روک پائے اُسے
وقت کچھ اس طرح سے چلتا رہا

بات کا رُخ کبھی، کبھی پہلو
ہجر کی شام وہ بدلتا رہا

○

ہر پل دھیان میں بسنے والے لوگ افسانے ہو جاتے ہیں
آنکھیں بوڑھی ہو جاتی ہیں خواب پرانے ہو جاتے ہیں

ساری بات تعلق والی جذبوں کی سچائی تک ہے
مَیل دِلوں میں آ جائے تو گھر ویرانے ہو جاتے ہیں

منظر منظر کِھل اُٹھتی ہے پیراہن کی قوسِ قزح
موسم تیرے ہنس پڑنے سے اور سہانے ہو جاتے ہیں

* جھونپڑیوں میں ہر اک تلخی پیدا ہوتے مِل جاتی ہے
اِسی لیے تو وقت سے پہلے طفل سیانے ہو جاتے ہیں

* موسمِ عشق کی آہٹ سے ہی ہر اک چیز بدل جاتی ہے
راتیں پاگل کر دیتی ہیں دِن دیوانے ہو جاتے ہیں

* دُنیا کے اِس شور نے امجد کیا کیا ہم سے چھین لیا ہے
خود سے بات کیے بھی اب تو کئی زمانے ہو جاتے ہیں

تجھے یاد ہے اسی ریت پر

میں ہوں جس مکان کی چھت تلے
مرا گھر نہیں
ترا نام درج ہے جس جگہ
ترا دَر نہیں
تجھے یاد ہے!
تجھے یاد ہے کسی شام ہم نے بنایا تھا
کہیں ایک چھوٹا سا ریت گھر
اُسی ریت سے، اُسی ریت پر
(اُسی ریت پر
جو تھی راہ میں کسی موج کے
کبھی اپنے ہونے کے دھیان میں
کبھی معجزوں کے گمان میں)
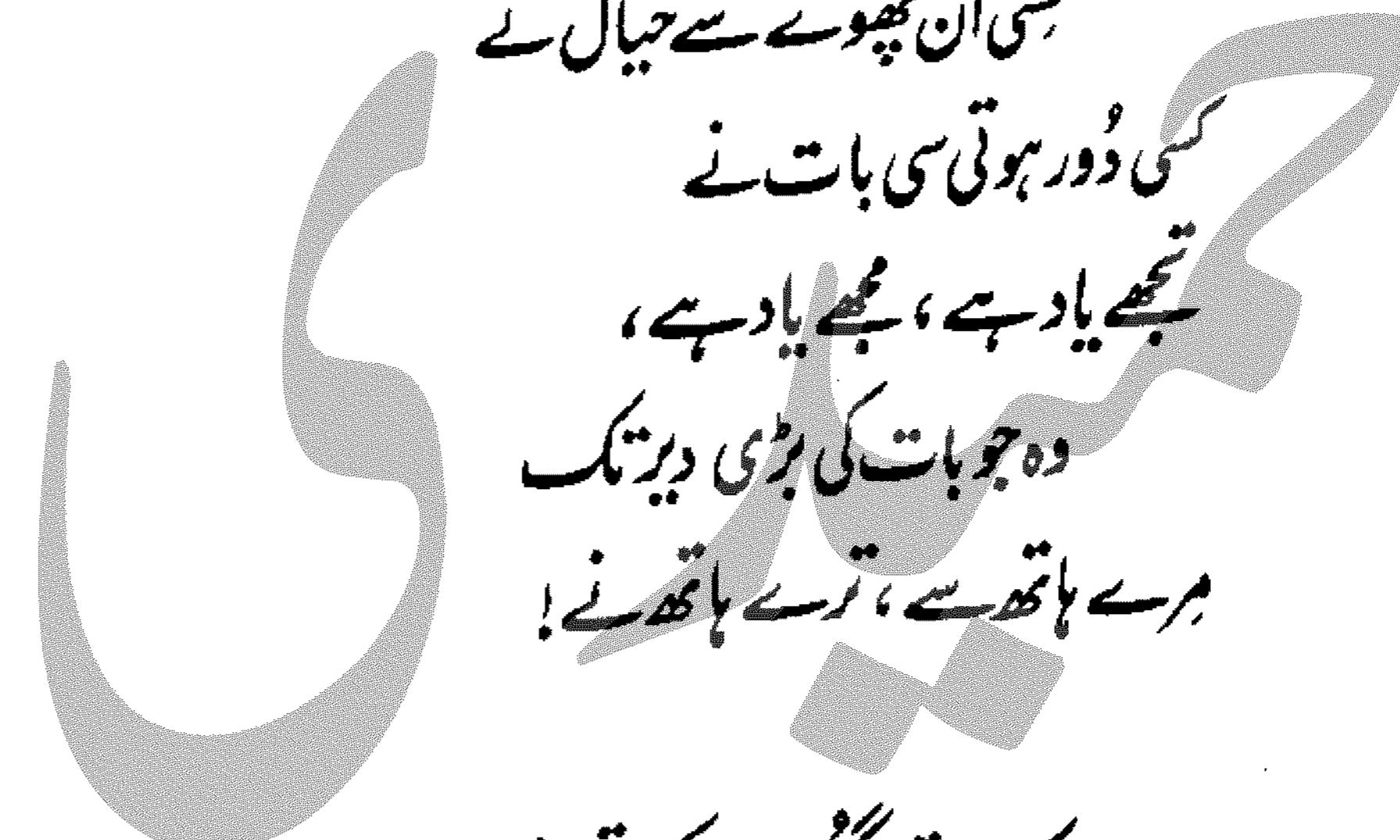
ہمیں علم تھا،
ہمیں علم تھا کہ وہ ریت گھر
جو تھے منتظر کسی موج کے
انھیں ٹوٹ جانے سے روکنے کا خیال امرِ محال ہے
اِسی موج و ریگ کے کھیل سے ہی بحال ہے
وہ تلازمہ،
وہی رابطہ، جسے ماننے کے فشار میں
رہِ آگہی کے سراب بھی
سبھی خواب بھی
اِسی ایک لمحۂ مختصر کے حصار میں ہے گھِرا ہُوا
خطِ ریگ بھی، کفِ آب بھی!

پہ یہ داستاں،
تو تھی ترجماں، کسی کھیل کی

اُسی کھیل کی
جسے کھیلتے ہمیں آ لیا کسی رات نے
اُسی رات نے
جسے اپنے خوں سے جواں کیا
مرے شوق نے، ترے ساتھ نے
کسی ان چھوئے سے خیال نے
کسی دُور ہوتی سی بات نے
تجھے یاد ہے، مجھے یاد ہے،
وہ جو بات کی بڑی دیر تک
مرے ہاتھ سے، ترے ہاتھ نے!

کہاں تھا گماں، کسے تھی خبر!
جو کہا تھا شوق کی لہر نے
جو لکھا تھا ریت کی لَوح پر

اُسی ایک شام کا کھیل تھا
اُسی ایک پَل کا جمال تھا
اُسی کھیل میں
اُسی شام کو
وہ جو ریت گھر سے بکھر گئے
وہ جو ایک پَل میں اُجڑ گئے
مرے خواب تھے!
ترے خواب تھے!

اُسی ایک نقش کے عکس ہیں

اُسی ایک نقش کے عکس ہیں
یہ زمین بھی یہ زمان بھی
جواں آرزو کے صنم کدے
تھکی جستجو کے جہان بھی!
وہی ایک موجِ نمود ہے کبھی دشت میں کبھی باغ میں
اُسی ایک ڈال کے پھول ہیں
یہ یقین بھی یہ گمان بھی!

○

نہیں اب جہاں پہ نشان بھی
یہاں لوگ بھی تھے مکان بھی

مری آرزو میں جیئے گا وہ
مجھے کب تھا ایسا گمان بھی!

تری بے رُخی کے فشار سے
کبھی مِل سکے گی امان بھی؟

اسی خاکداں کے حصار میں
مری خواہشوں کا جہان بھی

مری گمرہی کے غبار میں
مری منزلوں کے نشان بھی

عجب اُس کا رنگِ جمال ہے
کہ چمک اُٹھا ہے مکان بھی

عجب اُس حسیں کا خیال ہے
کہ مہک رہا ہے گمان بھی

اسی آسمان کی چھت تلے
مرا آشیاں بھی، اُڑان بھی

ترے اِک اشارے کے منتظر
یہ زمین بھی یہ زمان بھی
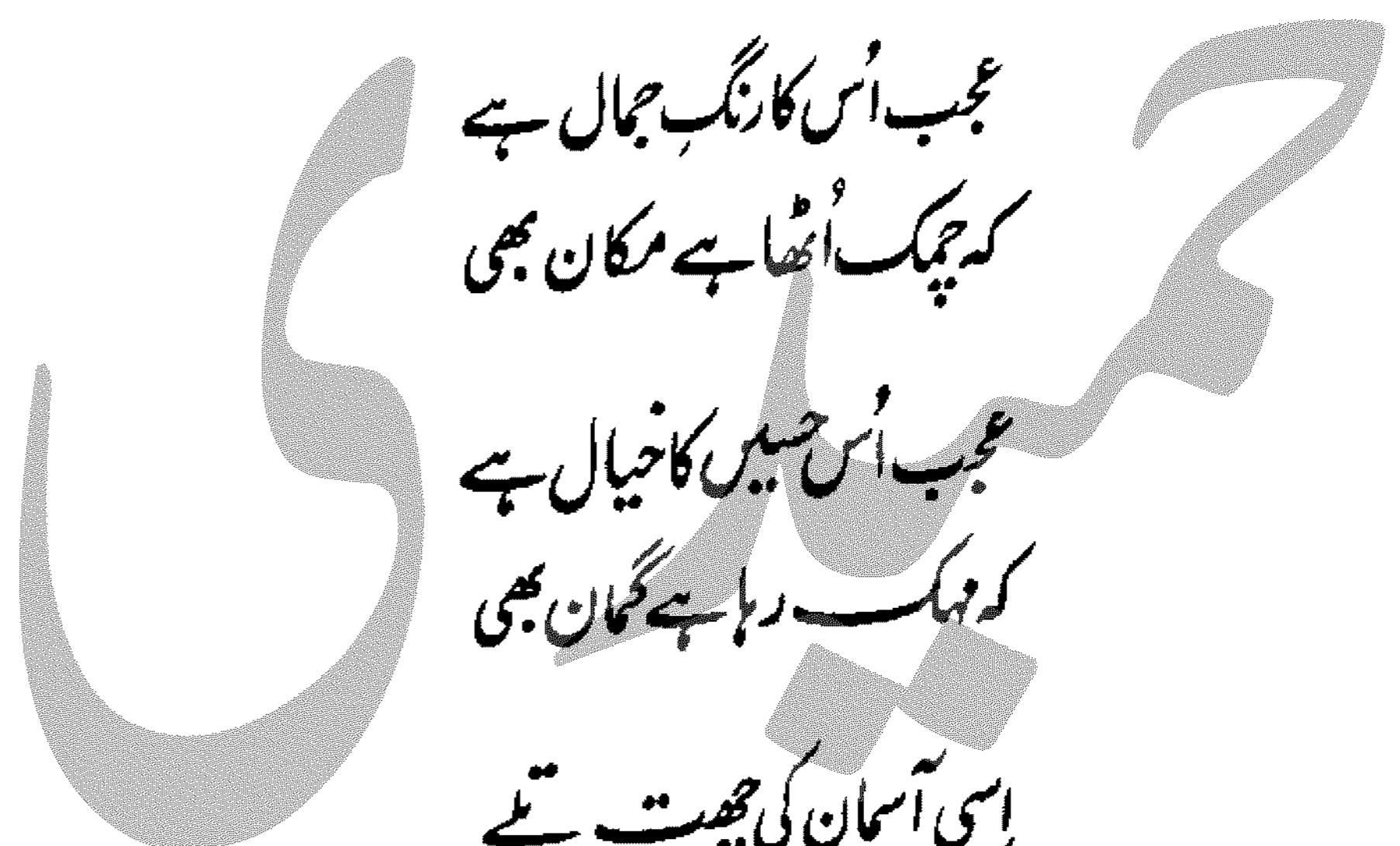
تری چشمِ خوش کی پناہ میں
مرے خواب بھی، مرے مان بھی

میں جہاں گیا مرے ساتھ تھی
مری عمر بھر کی تھکان بھی

بہت اچھا بھی لگتا ہے

بہت اچھا بھی لگتا ہے
اچانک اس طرح دل کا دوبارہ مبتلا ہونا،
محبّت آشنا ہونا،

مگر جب دیکھتا ہوں
وقت کتنا جا چکا ہے
راستوں کی دُھول
قدموں اور سروں پر کس طرح سے جم چکی ہے
اور ہم تم
اپنی اپنی زندگی کے دائروں میں
اپنی اپنی گردشوں میں
اس طرح اُلجھے ہوئے ہیں

جس طرح دشتِ فلک میں ساتھ چلتے،
دو ستارے
جو بظاہر پاس لگتے ہیں
مگر اُن کی رفاقت میں
کروڑوں میل کی تنہائی کا دریا بھی ہوتا ہے،

"یہ دریا پار کیسے ہو
نہ تم ہو اُس کنارے پر
نہ ہم ہیں اس کنارے پر"

سو بہتر ہے
ہم اپنے اپنے دائروں کے اِس خلا میں گھومتے جائیں
ستاروں کی طرح
اِک ساتھ چمکیں اور دمکیں تو سہی لیکن
یہ اپنے بیچ میں جو فاصلوں کا سُرخ دریا ہے
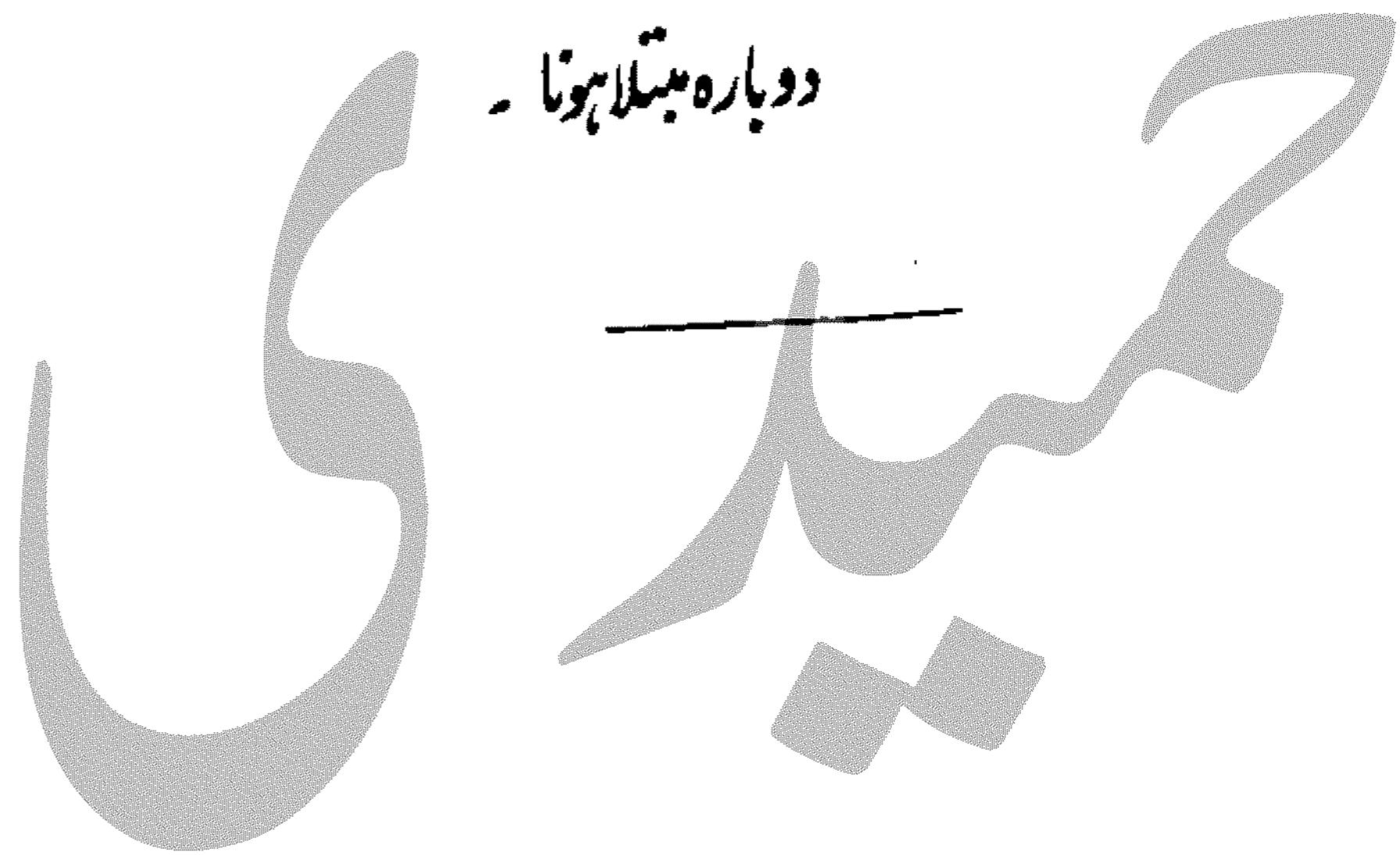
اسے تسلیم ہی کریں!
کہ اس بے پُل کے دریا میں
نہ تم ہی تیر سکتے ہو، نہ ہم ہی تیر سکتے ہیں!

بہت اچھا تو لگتا ہے!
اچانک اِس طرح دل کا محبّت آشنا ہونا
دوبارہ مبتلا ہونا۔
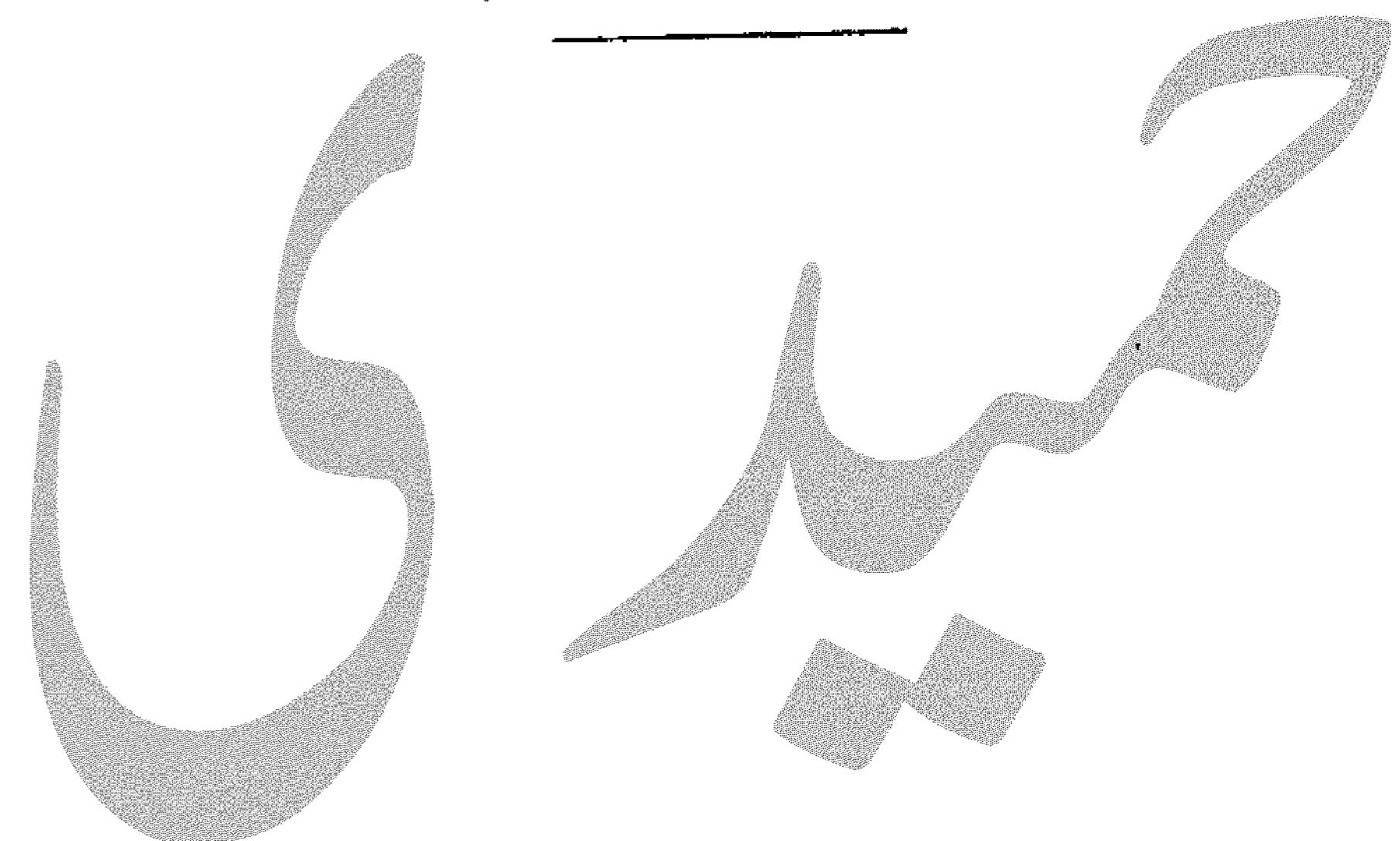
○

* کہیں بے کنار سے رتجگے، کہیں زرنگار سے خواب دے!
ترا کیا اُصول ہے زندگی؟ مجھے کون اس کا جواب دے!

* جو بچھا سکوں ترے واسطے، جو سجا سکیں ترے راستے،
مری دسترس میں ستارے رکھ، مری مٹھیوں کو گلاب دے

یہ جو خواہشوں کا پرند ہے، اسے موسموں سے غرض نہیں
یہ اُڑے گا اپنی ہی موج میں، اِسے آب دے کہ سراب دے!

* تجھے چھُو لیا تو بھڑک اُٹھے مرے جسم وجاں میں چراغ سے
اِسی آگ میں مجھے راکھ کر، اسی شعلگی کو شباب دے

کبھی یوں بھی ہو ترے رُوبرو، میں نظر ملا کے یہ کہہ سکوں
"مری حسرتوں کو شمار کر، مری خواہشوں کا حساب دے!"
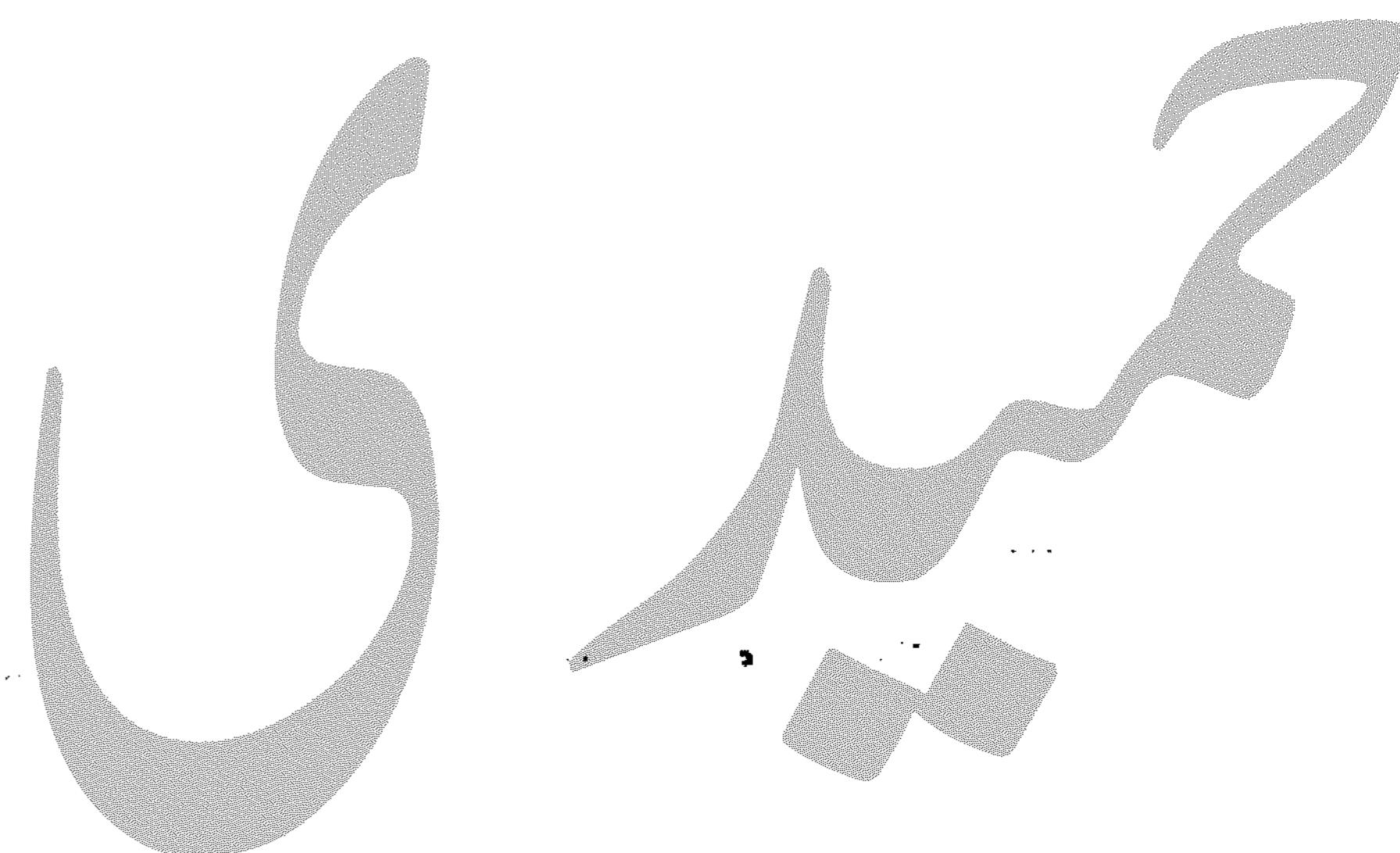
* تری اِک نگاہ کے فیض سے مری کشتِ حرف چمک اُٹھے
مرا لفظ لفظ ہو کہکشاں مجھے ایک ایسی کتاب دے

○

ممکن نہیں تھا جو وہ ارادہ نہیں کیا
ہم نے تجھے بھلانے کا وعدہ نہیں کیا

لہجے میں اُس کے رنگ تھا کم اعتماد کا
ہم نے بھی اعتبار زیادہ نہیں کیا

تھے مصلحت کی راہ میں سائے بہت گھنے
پر دل نے اختیار وہ جادہ نہیں کیا

* جھولی میں ہم نے بھر لیے فاقے سمیٹ کر
دامن کسی کے آگے کشادہ نہیں کیا

تھے، خاکِ پائے اہلِ محبت ، مگر کبھی
سجدہ، بہ پیشِ تاج ولبادہ نہیں کیا

حرمت شناسِ درد تھے، سو ہم نے عُمر بھر
امجدؔ، حدیثِ جاں کا اعادہ نہیں کیا

بازی
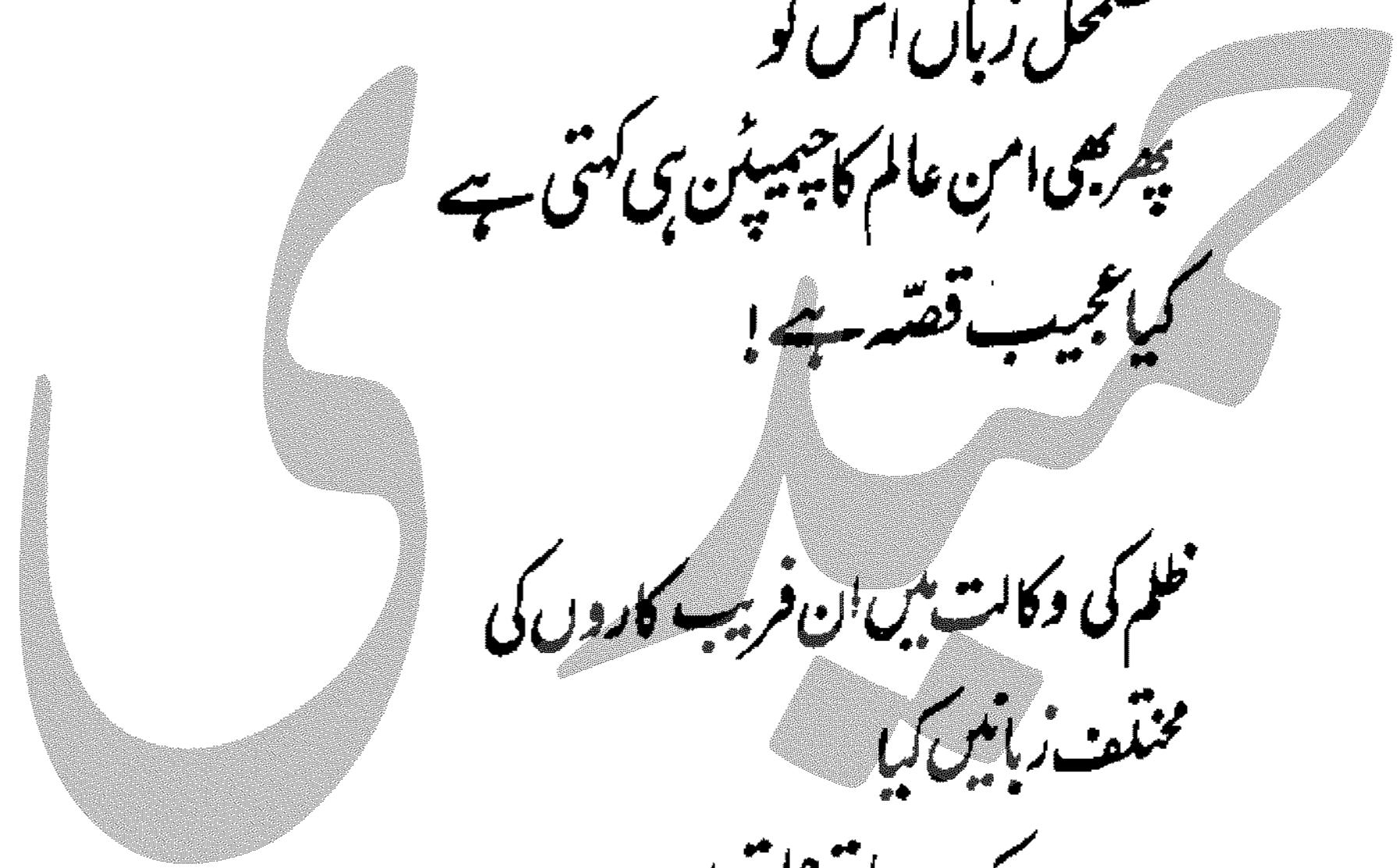
کیا عجیب قصّہ ہے!
اِس زمیں کے نقشے پر
جو غریب قومیں ہیں
اُن کے پاس جو کچھ ہے
جتنے زور والے ہیں، سب اُنھی کا حصّہ ہے
کیا عجیب قصّہ ہے!

کیا عجیب قصّہ ہے،
زیرِ دست قوموں کی
سرحدیں بدل جائیں
دستِ اہلِ حشمت کی جنبشِ قلم سے وہ

اطلسوں کے صفحوں سے
ایک دم نکل جائیں
آستین قاتل کی پھر بھی صاف رہتی ہے
خون اُس کے ہاتھوں پر سربسر چمکتا ہو
زخم کھانے والوں کی
مضمحل زباں اُس کو
پھر بھی امنِ عالم کا چیمپئن ہی کہتی ہے
کیا عجیب قصّہ ہے !

ظلم کی وکالت ہیں ان فریب کاروں کی
مختلف زبانیں کیا
ایک ساتھ چلتی ہیں
ریشمی سے لفظوں میں
وحشتیں اگلتی ہیں
آرزوئیں دُنیا کے ، زیردست لوگوں کی

آنسوؤں میں پلتی ہیں
سسکیوں میں ڈھلتی ہیں

(۲)

اِس قمار خانے میں اس گھڑی جو بازی ہے
(دل بہت ہی راضی ہے)
جتنے اچھے پتّے ہیں
سب ہیں ان کے ہاتھوں میں !
آستیں میں سُورج ہیں
چاند ان کے ہاتھوں میں !

(۳)

تاش کھیلنے والے !
یہ تو جانتے ہوں گے !
ہاتھ کتنا اچھا ہو ، جیت کتنی بھاری ہو
تاش کے یہ پتّے تو بار بار بٹتے ہیں
کھیل آگے چلنا ہے
بازیاں بدلنی ہیں

ایک دن بھی چالیں
دُوسروں نے چلنی ہیں!!

(۴)

وقت کے عناں گیرو، اٹلسوں کے رکھوالو!
کھیل جیتنے والو!
ہار کی گھڑی کو بھی زندگی کی بازی کا
ایک رنگ جانو گے!
پستیوں میں گِر کر بھی
کیا یہ بات مانو گے!

مدّو جزرِ دنیا کا یہ ہی اصل قصّہ ہے!
جس کے ہاتھ جو آئے' وہ اُسی کا حصّہ ہے!
کیا یہ بات مانو گے!
کیا یہ بات مانو گے!!

رات کیوں ہو گئی ؟

میرے شہروں کو کس کی نظر لگ گئی
میری گلیوں کی رونق کہاں کھو گئی
روشنی بجھ گئی ، آگہی سو گئی
ہم تو نکلے تھے ہاتھوں میں سُورج لیے
رات کیوں ہو گئی؟

رات کیوں ہو گئی، طالبانِ سحر!
ہم سے کیوں روشنی نے یہ پردا کیا
کیوں اندھیروں نے رستوں پہ سایا کیا
آؤ سوچیں ذرا
ہم بھی سوچیں ذرا، تم بھی سوچو ذرا

آگہی سے پرے، روشنی کے بنا
جتنے امکان ہیں سارے مر جائیں گے
جو بھی تخلیق ہے وہ بکھر جائے گی
زندگی اپنے چہرے سے ڈر جائے گی
طالبانِ سحر، آؤ سوچیں ذرا، آؤ دیکھیں ذرا،
آرزو کے ستاروں سے دمکا ہوا
پرچمِ روشنی کس طرح پھٹ گیا!
کون سا موڑ ہم سے غلط کٹ گیا!
پھول رُت میں خزاں کس طرح چھا گئی!
بیج کیا بو گئی!
ہم تو نکلے تھے ہاتھوں میں سُورج لیے
رات کیوں ہو گئی!!
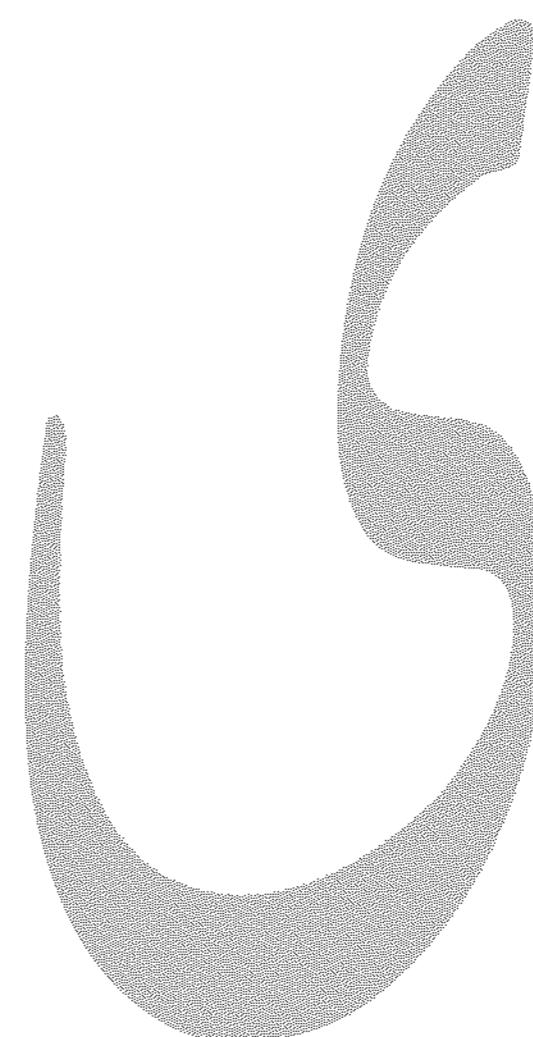
وہ ملال تو کوئی اور تھا

مرے چار سُو جو کھلا رہا وہ جمال تو کوئی اور تھا!
مرے خواب جس میں اُلجھ گئے وہ خیال تو کوئی اور تھا!
یہاں کس حساب کو جوڑتے
مرے صبح و شام بکھر گئے!
جو ازل کی صُبح کیا گیا وہ سوال تو کوئی اور تھا!
جسے تیرا جان کے رکھ لیا وہ ملال تو کوئی اور تھا!

ہانگ چُو[1]

ہے پہاڑوں کے درمیاں یہ نگر
جیسے محبوب کا حسیں چہرا
اپنے عاشق کے گرم ہاتھوں کے
پُرطلب، مضطرب حصار میں ہو
ایک بوسے کے انتظار میں ہو!

یوں فضا ہو رہی ہے سرتاسر
رنگ جیسے ہوا میں حل جائے
آنکھ میں ڈوبتے ہیں یوں منظر
ڈھیر ریشم کا جس طرح کوئی
اُنگلیوں سے پھسل پھسل جائے

[1] عوامی جمہوریہ چین کا ایک خوبصورت شہر

جھیل میں تیرتے ہوئے یہ کنول
بے حد و بے شمار ایسے ہیں
آسماں پر ہوں جس طرح، انجم
جیسے حلقہ کیے ہوئے، موسم
اِک گُلِ نوبہار کی خاطر
خواہشِ وصل میں نہائے ہوئے
جیسے آغازِ عاشقی کے خواب،
کہکشاں راہ میں بچھائے ہوئے

شاعرِ چین کا کہا سچ ہے
"جھیل یہ ہانگ چُو کے دامن کی
جیسے کوئی حسین عورت ہے"
ایک جنت ہے آسمانوں پر
ہانگ چُو اس زمیں پہ جنت ہے

پیکنگ؎

نگاہِ شاعرِ مشرق کی پیش بینی نے
ہمالیہ کے جو چشمے اُبلتے دیکھے تھے
نمُو کے جوش نے دریا بنا دیا ہے انھیں
ہر ایک آنکھ میں ٹھہرے تھے جتنے خوابِ گراں
نگارِ صبح کا چہرا بنا دیا ہے انھیں

ہر ایک شے سے نمایاں ہے لذّتِ تعمیر
ہر ایک نقش ہے اک شاہکار محنت کا
بس ایک خواب ہی دیکھا تمام آنکھوں نے
ہر ایک بوئے گا خوشیاں، ہر ایک کاٹے گا

ہر ایک رشتۂ اُلفت میں استوار بھی ہیں
یہ لوگ ایک بھی ہیں اور بے شمار بھی ہیں
جہانِ نو کی حسیں صبح کا نکھار ہیں یہ
یہ شہر باغ ہے اور قاصدِ بہار ہیں یہ

؎ عوامی جمہوریہ چین کا صدر مقام — پرانا نام پیکنگ

شنگھائی؎

ڈیڑھ کروڑ انسان
یک دل اور یک جان
ہاتھ میں ڈالے ہاتھ
آگے بڑھتے جائیں
اِک دُوجے کے ساتھ
منزل روشن ہے
مہکی سبز بہار
گُلشن گُلشن ہے
محنت پر ایقان
ڈیڑھ کروڑ انسان
ہر جانب تعمیر
مٹی پتھر دھات
سب میں ہے تنویر

؎ عوامی جمہوریہ چین کا ساحلی شہر

سایا کرتے دُکھ
مِل کر بانٹتے ہیں
سارے دُکھ اور سُکھ

بستی، دِل، کھلیان
ڈیڑھ کروڑ انسان

ہر اِک ہے مزدور
ساجھی خوشیوں ہیں
رہتے ہیں مسرور
ہر غنچہ کِھلتا ہے
اِک جیسا انصاف
سب کو مِلتا ہے
محنت سب کی شان
یک دل اور یک جان
ڈیڑھ کروڑ اِنسان

ایک دِن

آخری چند دن دسمبر کے
ہر برس ہی گراں گزرتے ہیں
خواہشوں کے نگار خانے سے
کیسے کیسے گماں گزرتے ہیں!

رفتگاں کے بکھرتے سایوں کی
ایک محفل سی دل میں سجتی ہے
فون کی ڈائری کے صفحوں سے
کتنے نمبر پکارتے ہیں مجھے
جن سے مربوط، بے نوا، گھنٹی
اب فقط میرے دل میں بجتی ہے

کس قدر پیارے پیارے ناموں پر
رینگتی بدنما لکیریں سی

میری آنکھوں میں پھیل جاتی ہیں
دُوریاں، دائرے بناتی ہیں،
دھیان کی سیڑھیوں پہ کیا کیا عکس
مشعلیں درد کی جلاتے ہیں
نام جو کٹ گئے ہیں اُن کے حرف
ایسے کاغذ پہ پھیل جاتے ہیں
حادثے کے مقام پر جیسے
خُون کے سُوکھتے نشانوں پر
چاک سے لائنیں لگاتے ہیں

پھر دسمبر کے آخری دن ہیں
ہر برس کی طرح سے اب کے بھی
ڈائری ایک سوال کرتی ہے
"کیا خبر اس برس کے آخر تک
میرے ان بے چراغ صفحوں سے

کتنے ہی نام کٹ گئے ہوں گے!
کتنے نمبر بکھر کے رستوں میں
گردِ ماضی سے اَٹ گئے ہوں گے!
خاک کی ڈھیریوں کے دامن میں
کتنے طوفاں سمٹ گئے ہوں گے!

ہر دسمبر میں سوچتا ہوں میں
ایک دن اس طرح بھی ہونا ہے
رنگ کو روشنی میں کھونا ہے
اپنے اپنے گھروں میں رکھی ہُوئی
ڈائری، دوست دیکھتے ہوں گے!
اُن کی آنکھوں کے خاکدانوں میں
ایک صحرا سا پھیلتا ہوگا!
اور کچھ بے نشان صفحوں سے
نام میرا بھی کٹ گیا ہوگا!!

بھنور میں کھو گئے اِک ایک کر کے ڈوبنے والے
سرِ ساحل کھڑے تھے سب تماشا دیکھنے والے

خدا کا رِزق تو ہرگز زمیں پر کم نہیں یارو!
مگر یہ کاٹنے والے! مگر یہ بانٹنے والے!

کہاں یہ عشق کا سنگِ گراں ہر اِک سے اُٹھتا ہے!
بہت سے لوگ تھے یوں تو یہ پتھر چومنے والے

وفا کی راہ مقتل سے گزرتی ہے تو بسم اللہ،
نہیں پسپائی سے واقف تمہارے چاہنے والے

ازل سے ظلم دیکھے جا رہی ہیں، دیکھتی آنکھیں
ازل سے سوچ میں ڈوبے ہیں امجدؔ، سوچنے والے

کوئی ہجر تھا نہ وصال تھا مرے سامنے
مری آرزوؤں کا جال تھا مرے سامنے

میں گرا ہوں کتنی ہی بار پھر بھی رُکا نہیں
مگر ایک تیرا خیال تھا مرے سامنے
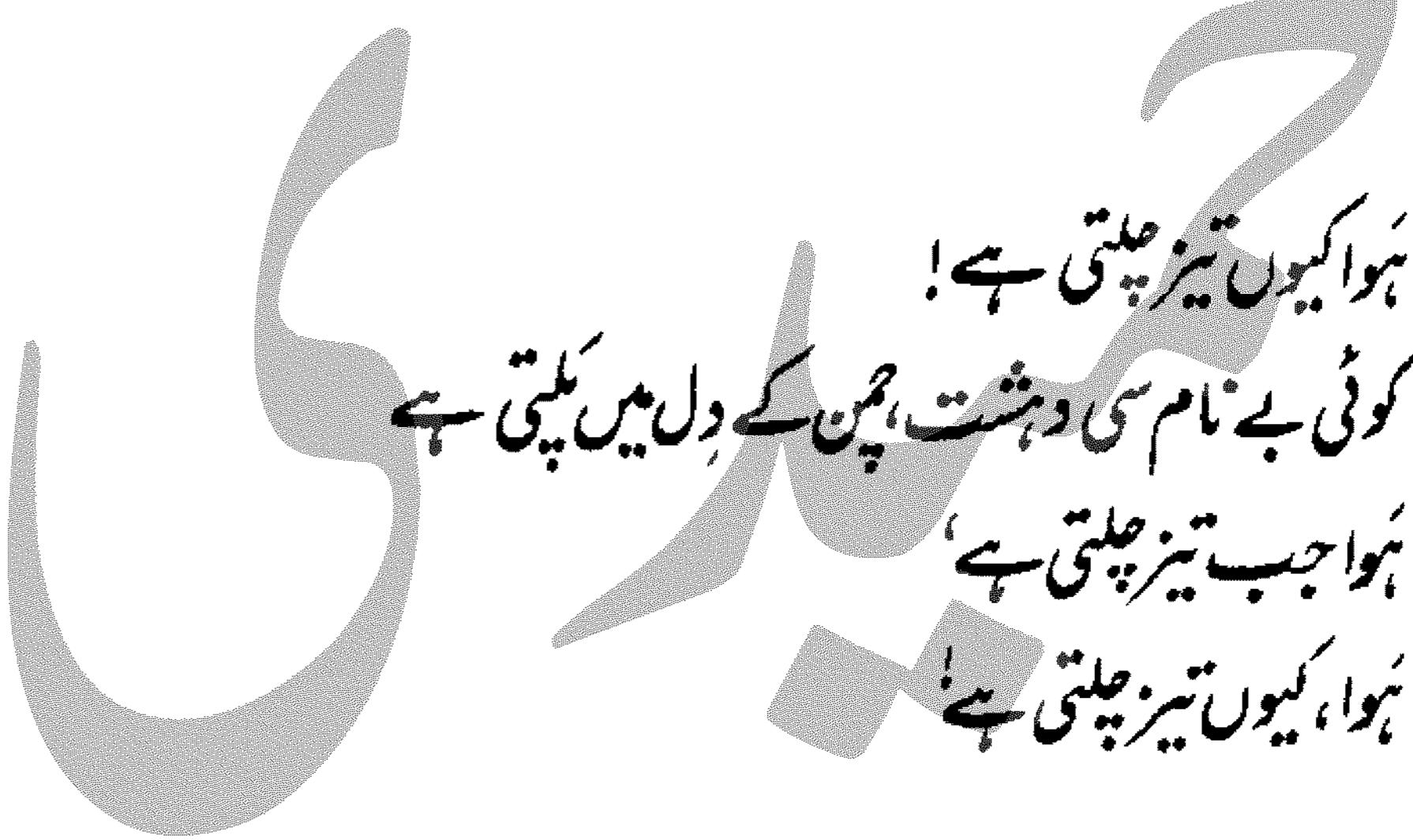
کسی آنکھ میں نہ تھی روشنی، کسی خواب کی
عجب ایک شہرِ ملال تھا مرے سامنے

لیے انگ میں پیاس سی ، سرِ شام وہ
مری خواہشوں کی مثال تھا مرے سامنے

مجھے رات اپنی نگاہ پہ بھی یقیں نہ تھا
کوئی معجزوں سا کمال تھا مرے سامنے

سرِ بزم جب کسی آئنے پہ نظر پڑی
وہی ایک عکسِ جمال تھا مرے سامنے

وہی ایک چُپ کا غبار تھا پسِ چشمِ نم
وہی ایک تشنہ سوال تھا مرے سامنے!

ہَوا کیوں تیز چلتی ہے!
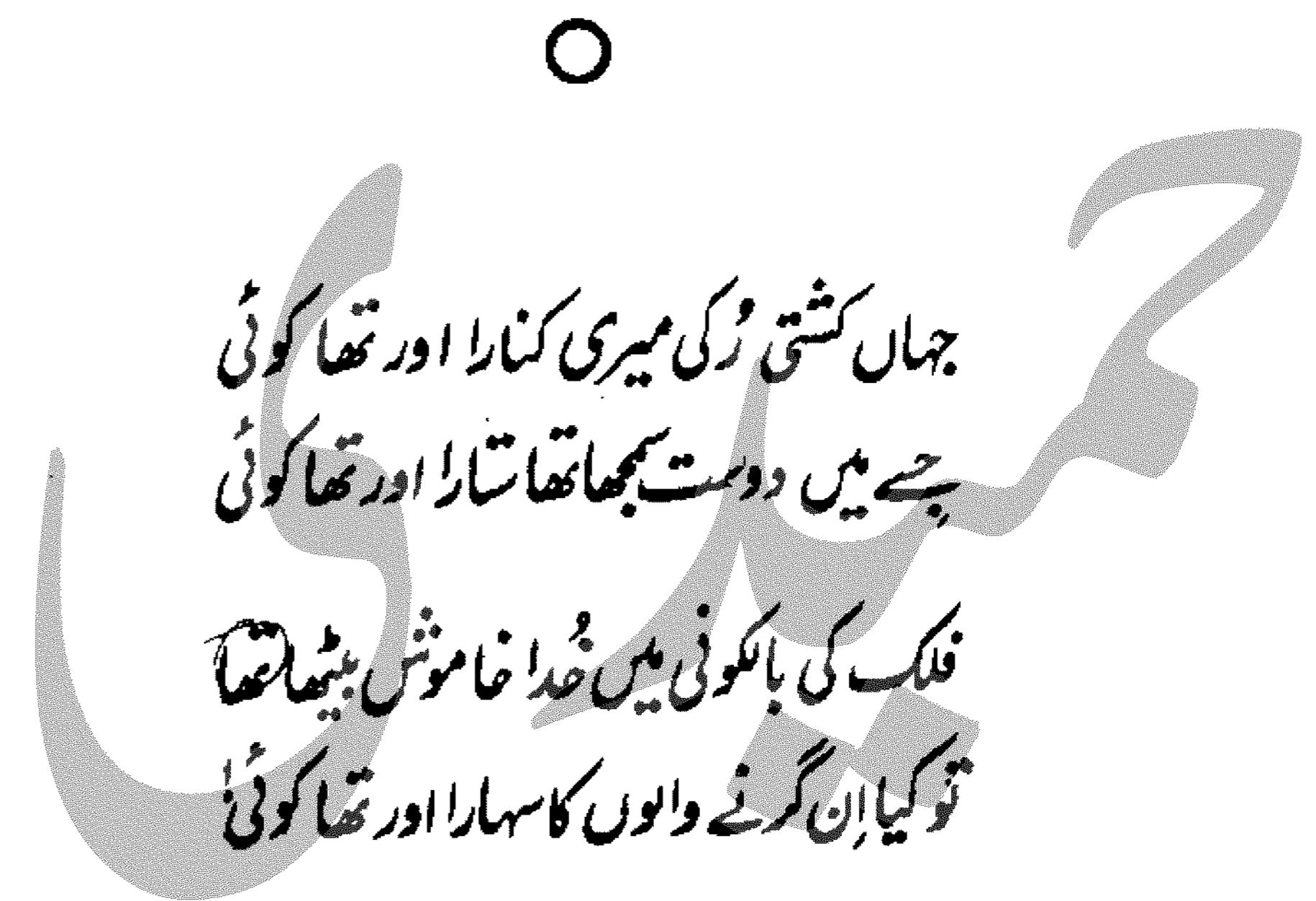
ہَوا کیوں تیز چلتی ہے!
کوئی بے نام سی دہشت، چمن کے دِل میں پَلتی ہے
ہَوا جب تیز چلتی ہے،
ہَوا، کیوں تیز چلتی ہے!

ابھی کلیوں کے چہرے پر بہت سی اوس پڑنی تھی
ابھی پھُولوں نے موسم سے کچھ اپنی بات کرنی تھی
ابھی سے کیوں یہ شمعِ زندگی، بُجھ بُجھ کے جلتی ہے
ہَوا کیوں تیز چلتی ہے!

لپٹ جائے کبھی یہ بادباں سے، موج سے اُلجھے
کسی صُورت نہ اُلجھن سیلِ بے زنجیر کی سُلجھے
سفینے لَوٹ کر آئے نہیں اور شام ڈھلتی ہے
نواحِ ساحلِ غم میں ہَوا پھر تیز چلتی ہے
ہَوا کیوں تیز چلتی ہے!

○

جہاں کشتی رُکی میری کنارا اور تھا کوئی
جسے میں دوست سمجھا تھا ستارا اور تھا کوئی

فلک کی بالکونی میں خُدا خاموش بیٹھا تھا
تو کیا اِن گرنے والوں کا سہارا اور تھا کوئی!
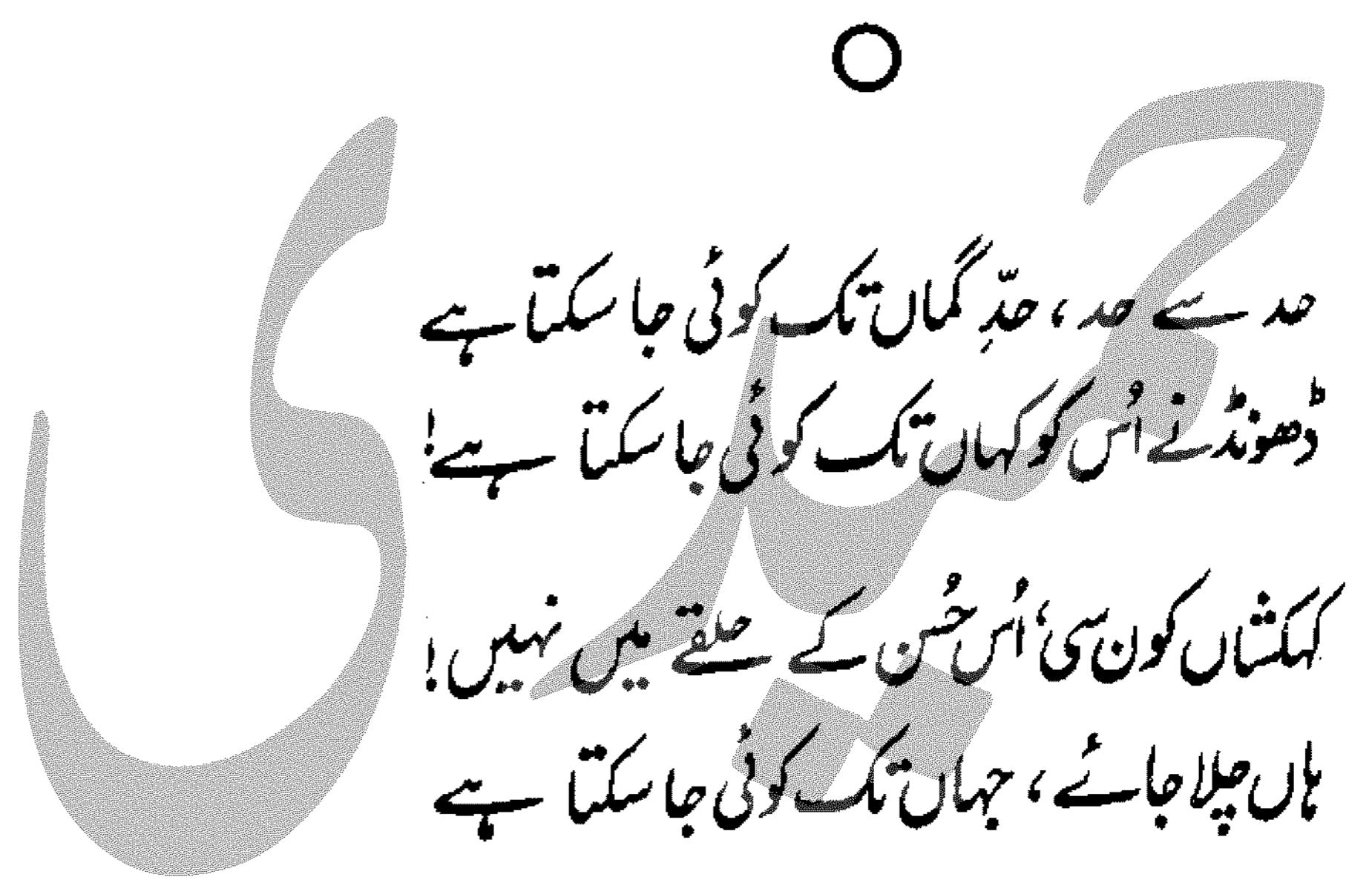
بُجھی آنکھوں کے دامن میں جمی تھی دُھول برسوں کی
وہ چہرا اب جو دیکھا ہے دوبارا، اور تھا کوئی

بہت عادل سہی مُنصف، مگر انصاف کیسے ہو!
گواہی اور ہے، قاتل ہمارا، اور تھا کوئی!

ہَوا کی سمت دیکھی اور کشتی ڈال دی ہم نے
کُھلا آ کر سمندر میں اشارا اور تھا کوئی

فضا مہکی، چمن جاگا، اچانک کھل اُٹھے تارے
کِسی کے مُسکراتے ہی نظارا اور تھا کوئی

* وہی مانوس لہجہ تھا، وہی آواز تھی امجدؔ
مگر جو مڑ کے دیکھا تو پکارا اور تھا کوئی

حد سے حد، حدِّ گماں تک کوئی جا سکتا ہے
ڈھونڈنے اُس کو کہاں تک کوئی جا سکتا ہے!

کہکشاں کون سی؟ اُس حُسن کے حلقے میں نہیں!
ہاں چلا جائے، جہاں تک کوئی جا سکتا ہے

کسی مانوس سے لہجے کا اِشارا مل جائے
معجزہ ہائے بیاں تک کوئی جا سکتا ہے

کشتیٔ شوق ہے خطرے کے نشاں سے آگے
اور خطرے کے نشاں تک کوئی جا سکتا ہے

پھیلتے جاتے ہیں ہر سَمت وہ اُڑتے گیسو
رات کے ساتھ کہاں تک کوئی جا سکتا ہے!

مرتبہ میرا یہی ہے کہ زمیں زاد ہُوں میں
سو وہاں ہوں کہ جہاں تک کوئی جا سکتا ہے

راستے عشق کے آسان نہیں ہیں، امجدؔ
ہاں مگر جاں کے زیاں تک کوئی جا سکتا ہے

خواب

صاحبو، خواب پرندوں کی طرح ہوتے ہیں
چھونا چاہو تو یہ اُڑ جاتے ہیں
اور پھر ہاتھ نہیں آتے ہیں

کبھی اِک شاخِ تمنّا پہ مہکتے ہوئے گاتے رہنا
داستاں، دُور کے دیسوں کی سُناتے رہنا
ہر نئی رُت میں نیا گیت بنا کر لانا
کبھی ہنسنا، کبھی تا دیر رُلاتے رہنا

اُڑتی خوشبو کی طرح قید نہیں ہو سکتے
کسی بھی تیر سے یہ صَید نہیں ہو سکتے
کبھی منزل کبھی رستوں کی طرح ہوتے ہیں
صاحبو، خواب پرندوں کی طرح ہوتے ہیں

صاحبو، خواب کھلونوں کی طرح ہوتے ہیں
آبگینوں کی طرح پھُوٹ گئے
اِک ذرا ٹھیس لگی، ٹوٹ گئے!

یہ کسی عُمر، کسی وقت کے پابند نہیں
کبھی گڑیا کی طرح سوئیں گلے سے لگ کر
کبھی کونوں میں پڑے رہتے ہیں بیگانے سے
کسی مانوس سی آہٹ کا اشارا پا کر
دھیان کے طاق میں سجتے ہیں پری خانے سے
خواہشیں دل میں کھلاتی ہیں ستارے کیا کیا!
آنکھ میں خواب کا اِک چاند اُتر آنے سے
کبھی اپنے کبھی غیروں کی طرح ہوتے ہیں
صاحبو، خواب کھلونوں کی طرح ہوتے ہیں

صاحبو، خواب مکانوں کی طرح ہوتے ہیں
جو بڑی دیر میں گھر بنتے ہیں
اور اِک پَل میں کھنڈر بنتے ہیں

اِن دَر و بام میں جو لوگ تھے زندہ' وہ گئے
پر یہ آواز کے سائے نہیں، مرنے والے!
شب کی پہنائی میں کچھ کھوئے ہوئے قدموں کی
آہٹیں ڈھونڈتے رستے، نہیں مرنے والے!

کس قدر رنگ بہم ہوں تو بنے گُلدستہ
ایک لمحے میں بکھر جائیں کسی بات سے وہ!
عُمر بھر جاگ کے کاتیں جو ملائم ریشم
آنکھ جھپکیں تو پھسل جائے وہیں ہاتھ سے وہ

گمشدہ آگ کے شعلوں کی طرح ہوتے ہیں
صاحبو، خواب مکانوں کی طرح ہوتے ہیں

○

زیرِ لب یہ جو تبسّم کا دِیا رکھّا ہے
ہے کوئی بات جِسے تم نے چھپا رکھّا ہے

چند بے ربط سے صفحوں میں کتابِ جاں کے
اِک نشانی کی طرح عہدِ وفا رکھّا ہے

ایک ہی شکل نظر آتی ہے، جاگے' سوئے
تم نے جادُو سا کوئی مجھ پہ چلا رکھّا ہے

یہ جو اِک خواب ہے آنکھوں میں نہفتہ، مت پوچھ
کس طرح ہم نے زمانے سے بچا رکھّا ہے!

کیسے خُوشبو کو بکھر جانے سے روکے کوئی!
رزقِ غنچہ اسی گٹھڑی میں بندھا رکھا ہے

کب سے احباب جسے حلقہ کیے بیٹھے تھے
وہ چراغ آج سرِ راہ ہوا، رکھا ہے

دن میں سائے کی طرح ساتھ رہا، لشکرِ غم
رات نے اور ہی طوفان اُٹھا رکھا ہے

یاد بھی آتا نہیں اب کہ گلے تھے کیا کیا
سب کو اُس آنکھ نے باتوں میں لگا رکھا ہے

دل میں خُوشبو کی طرح پھرتی ہیں یادیں، امجد
ہم نے اس دشت کو گلزار بنا رکھا ہے

اختر حسین جعفری کے لیے ایک نظم

آج وہ خود بھی بُجھ گیا یارو
جس نے اک روشنی کی رُخصت پر
یہ اَبد تاب لفظ لکھّے تھے
"تجھ کو کس پھُول کا کفن ہم دیں
تُو جُدا ایسے موسموں میں ہُوا
جب درختوں کے ہاتھ خالی ہیں"

آئنے جس کو ڈھونڈتے تھے، خود
ایسا بے مثل عکس گر تھا وہ
سارے کانٹے سمیٹ لیتا تھا
ایسا انمول ہم سفر تھا وہ

وہ جو زرتاب لفظ لکھتا تھا
انگلیاں اُس کی رزقِ خاک ہوئیں
کتنے سپنے ہوئے ہیں بے چہرا!
اُس کی آنکھیں جو بجھ کے راکھ ہوئیں

اپنے دل میں سنبھال کر اُس کو
آج ہاتھوں سے کھو رہے ہیں اُسے
ہچکیاں بندھ گئی ہیں لفظوں کی
آئنہ خانے رو رہے ہیں اُسے

اُس کو کس روشنی میں دفنائیں!
اُس کو کس خواب کا بدن ہم دیں!
وہ جو خوشبو میں ڈھل گیا یارو
اُس کو کس پھول کا کفن ہم دیں!

○

ایک دن اِس طرح بھی ہونا ہے
رنگ کو روشنی میں کھونا ہے

جاگنا ہے غبار میں ، ہم کو
خاک کی تیرگی میں سونا ہے

کتنی راتوں کو کر گیا جل تھل
ایک آنسو ابھی جو رونا ہے

عمر کی قیدِ بامشقت میں
جسم کا بوجھ ہم کو ڈھونا ہے

وقت اور بخت کے تعلّق میں
ایک بچّہ ہے اِک کھلونا ہے

تیری آنکھوں کے کُنجِ خوشبو میں
ہم کو بھی ایک خواب بونا ہے

اے مری چشمِ تر ، بتا تو سہی
کون سا داغ ہے جو دھونا ہے!

مکاں اور مکیں

اِتنی بڑی ان دُنیاؤں میں
اپنے نام کی تختی والی ، ایک عمارت
کتنے دُکھوں کی اینٹیں چُن کر گھر بنتی ہے

پتھر پتھر جوڑ کے دیکھو
میں نے بھی اِک گھر ہے بنایا
رنگوں ، پھُولوں ، تصویروں سے اس کو سجایا
دروازے کی لَوح پہ اپنا نام لکھایا

لیکن اس کے ہر کمرے میں تم رہتے ہو!

اِرادہ

سا دریا میں قطرے کی صُورت
گمُ ہو جاؤں
اپنے آپ سے باہر نکلوں
"تم" ہو جاؤں

امجد اسلام امجد کی تصانیف

برزخ

ساتواں در

فشار

اس پار

ذرا پھر سے کہنا

سحر آثار

بارش کی آواز

خزاں کے آخری دن

اتنے خواب کہاں رکھوں گا